کتب کی تصدیق قرآن کریم انہی دو طریق سے کرتا ہے جو

قرآن مجید کی دو طرح سے کتب سماویہ کی تصدیق۔

کتب تو دنیا میں موجود ہیں ان کی تو دونوں قسم کی تصدیق کرتا ہے یعنی ان کے بعض مسائل کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی بعض پیشگوئیوں کو اپنی ذات میں پورا کر کے انہیں سچا ثابت کرتا ہے دوسری تصدیق وہ یہ بھی کرتا ہے کہ سب کتب سماویہ کے متعلق وہ یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت انہیں دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا وہ سچی تھیں۔ وہ حضرت آدمؑ کے الہام۔ حضرت نوحؑ کے الہام حضرت ابراہیمؑ کے الہام حضرت موسیٰؑ کے الہام حضرت مسیحؑ کے الہام حضرت کرشنؑ کے الہام حضرت رامچندرؑ کے الہام حضرت زردشتؑ کے الہام۔ اور باقی ان تمام انبیاء کے الہاموں کی تصدیق کرتا ہے جو وقتاً فوقتاً اور مختلف مُلکوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے خواہ ان کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں چنانچہ فرماتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (مومن ع ۸) یعنی اے محمد رسول اللہ ہم تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیج چکے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے قرآن میں کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا اور یاد رکھو کہ کسی رسول کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی نشان لے آئے پس جب اللہ کا حکم آ جائے تو سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور جو بھی جھوٹا ہو ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ صرف وہی نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آ چکے ہیں پھر یہ سوال اُٹھایا ہے کہ جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہم کیونکر جانیں کہ وہ سچے تھے تو اسکی یہ علامت بتائی ہے کہ رسول نشان لے کر آتا ہے اور نشان خدا تعالیٰ کی امداد کے بغیر کوئی نہیں دکھا سکتا۔ پس جو نشان دکھاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے پھر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ بہت سے نشان یعنی شہادت اور واقعات کے تفصیلی علم کو چاہتے ہیں اور مختلف اقوام جن لوگوں کو بطور اپنے نبیوں کے پیش کرتی ہیں ان کے تفصیلی حالات کا ہمیں علم نہیں پھر انکی سچائی کو کس طرح معلوم کریں تو اس سوال کا جواب اس طرح دیا کہ ایک نشان ایسا ہے جو سب نبیوں میں مشترک ہے اور وہ اپنی شہادت ہر وقت ساتھ رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی نبی دنیا میں آتا ہے آخر کار (۱) اس کے مخالف ہلاک ہو جاتے ہیں اور (۲) اس کا نام دُنیا میں رہ جاتا ہے اور اس کے اتباع کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جس مدعیٔ الہام کی تائید میں یہ امر دیکھو سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کی تائید اس کے حق میں ہے اور وہ جھوٹا نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف انہی انبیاء کا مصدق نہیں جن کے نام اس نے لئے ہیں بلکہ اُن انبیاء کا بھی مصدق ہے جن کے نام اس نے نہیں لئے اور جب وہ ایسے انبیاء کا مصدق ہے تو ان کے کلام کا بھی مصدق ہے اور اس نامعلوم یا غیر مذکور کلام کی تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اجمالاً ایمان لایا جائے کہ وہ سچے ہیں پس تصدیق کے دوسرے معنے اجمالی ایمان کے ہیں یعنی ان کلاموں کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور ایسی ہی تصدیق قرآن کریم یہود و نصاریٰ کی کتب کی بھی کرتا ہے پس اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم انکی موجودہ صورت کو صحیح قرار دیتا ہے ظلم ہے اور دیگر آیاتِ قرآنیہ اور واقعات اور خود انکی کتب کی اندرونی شہادت کے خلاف ہے۔

تصدیق کو لِمَا مَعَكُمْ کے الفاظ کے ساتھ مقید کرنے کے لحاظ سے قرآن مجید کے تورات و انجیل کے مصدق ہونے کا مطلب۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں تورات و انجیل کی تصدیق کا ذکر نہیں بلکہ لِمَا مَعَكُمْ کی تصدیق کا ذکر ہے یعنے قرآن جو کچھ انکے پاس ہے اس کا مصدق ہے اب اگر ان الفاظ کے وسیع معنے لئے جائیں تو ان کے یہ معنے ہونگے کہ ان کے قصوں کہانیوں کی بھی وہ تصدیق کرتا ہے لیکن یہ معنے بالبداہت باطل ہیں اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان الفاظ کو بعض قیود سے مقید کرنا ہوگا اور وہ قیود معقول طور پر یہی ہو سکتی ہیں (۱) اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ جو مضمون اس قسم

کی آیات سے پہلے یا بعد میں بیان ہو رہا ہے یہ الفاظ ساری کتاب کی نہیں بلکہ صرف اسکی تصدیق کے بارہ میں ہیں اور یہ مطلب لیا جاوے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو تعلیم ہماری ہے وہی تمہاری کتب میں ہے پس تصدیق خاص ہوگی نہ کہ عام۔ انہی معنوں کے رو سے یعنے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ قرآن کریم تمہاری کتب میں بیان شدہ پیشگوئیوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی انہیں پورا کرتا ہے (۲) یا پھر لِمَا مَعَكُمْ کو اس حد بندی سے محدود کیا جائے گا کہ تمہارے پاس جو خدا کا کلام ہے اسکی تصدیق قرآن کریم کرتا ہے اور ان معنوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں اس میں کیا شک ہے کہ پہلی کتب میں جو خدا کا کلام ہے اس کی تصدیق ہر دوسرے آسمانی کلام کو کرنی چاہیئے مگر اس تصدیق کے یہ معنے نہیں ہوسکتے کہ جو کچھ بھی ان کتب میں ہے وہ ضرور خدا کا کلام ہے۔

اس سوال کے متعلق ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ پہلی کتب کے لئے جس جس جگہ قرآن کریم میں تصدیق کا لفظ استعمال ہُوا ہے وہاں اس کا صلہ لام آیا ہے سوائے دو جگہوں کے جہاں کوئی صلہ استعمال نہیں ہُوا لیکن جہاں قرآن کریم یا رسول کریم کی نسبت یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کا صلہ با آتا ہے اور لغت سے بھی ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تصدیق کے معنے اس کو سچا قرار دینے کے ہوں وہاں با صلہ آتا ہے پس اس اختلاف سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں جہاں پُرانی کتب کی نسبت یہ لفظ استعمال ہُوا ہے اس کے اور معنے ہیں اور وہ یہی ہوسکتے ہیں کہ پہلی کتب میں جو پیشگوئیاں تھیں قرآن کریم ان کا پورا کرنے والا ہے یہ نہیں کہ ان کے اندر جو کچھ غلط یا درست لکھا ہُوا ہے اس کو سچا قرار دیتا ہے قرآن کریم کی بعض آیات بھی اس استدلال کی تصدیق کرتی ہیں سورۂ احقاف میں ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (احقاف ع ۱ و ع ۲) یعنے اے لوگو بتاؤ تو سہی کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئی اور تم نے اس کا انکار کردیا تو کیا بنے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اپنے مثل نبی آنے کی خبر دی ہے پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم نے تکبر سے کام لیا یاد رکھو کہ اللہ ظالموں کو کبھی کامیاب نہیں کرتا اور کافر مسلمانوں کے حق میں کہتے ہیں کہ اگر اس کلام میں کوئی بھلائی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے کس طرح ایمان لے آتے بات یہ ہے کہ چونکہ ان کو ہدایت نہیں ملی اب تو انہوں نے یہی کہنا ہُوا کہ پہلے کلام بھی جھوٹے تھے یہ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گزر چکی ہے جو لوگوں کو ہدایت دیتی تھی اور رحمت کا موجب تھی اور اب یہ کتاب اس کی مصدق ہے اور عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور محسنوں کو بشارت دے۔

لفظ تصدیق کے ساتھ دو مختلف صلے ذکر دو مختلف باتوں کی طرف اشارہ۔

ان آیات سے پہلے کی آیات پڑھو تو معلوم ہوگا کہ اس جگہ یہود نہیں بلکہ کفار مکہ مخاطب ہیں ان سے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اپنے مثیل کی خبر دی تھی (جس میں یہ بھی خبر تھی کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا) اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ موسیٰ نے بنو اسحاق میں سے ہو کر اسپر ایمان کا اظہار کیا اور تم جن کو عزت ملی تھی اپنی قوم کے نبی کے ماننے میں تکبر سے کام لے رہے ہو اسپر کفار کا اعتراض بیان فرمایا ہے کہ ہم تو اس کے جھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ اس کو ماننے والے ادنیٰ لوگ ہیں بڑے لوگ تو

سب اس کے مخالف ہیں اگر یہ سچا ہوتا تو سب سے پہلے
ہمیں اس پر ایمان لانے کا موقعہ ملتا۔ اس کا جواب یہ فرمایا
کہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے جو اپنی ہدایت اور
فائدہ کے لحاظ سے اپنی سچائی کا ثبوت دے چکی ہے اس میں
اس کتاب کے بارہ میں پیشگوئیاں ہیں جن کو یہ کتاب پورا
کرتی ہے چنانچہ ان پیشگوئیوں کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس کتاب
کی زبان عربی ہوگی اور دوسری یہ کہ اس کی قوم کے لوگ
اس کے مخالف ہونگے اب ان صدیوں پہلے کی پیشگوئیوں
کو جب یہ کتاب پورا کرتی ہے تو تم اس کا انکار کیونکر کر سکتے ہو
آئندہ شریعت کے عربی زبان میں ہونے کی پیشگوئی
استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ سے نکلتی ہے جہاں بتایا ہے کہ
آنے والا موعود بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی
بنو اسمٰعیل میں سے ہوگا اور اس کی مخالفت کی خبر استثناء
باب ۳۳ آیت ۲ سے نکلتی ہے جہاں لکھا ہے کہ وہ دس ہزار
قدوسیوں کے ساتھ آئے گا اور اس کے داہنے ہاتھ میں
آتشی شریعت ہوگی یعنی وہ ضرورت کے موقعہ پر جنگ
کرے گا اور جنگ کی اجازت دے گا۔ ظاہر ہے کہ جنگ
کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب قوم مخالفت کرے
اور مخالف زبردست ہوں۔ پس مکہ والوں کا یہ کہنا کہ ہم جو
بڑے لوگ ہیں ایمان نہیں لاتے یہ ان کے سچا ہونے کی
دلیل نہیں بلکہ قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے سچا ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے موسیٰ
کی خبر کا ایک اور حصہ پورا ہوا اور ایک طرف اس سے
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوئی تو دوسری
طرف حضرت موسیٰ کی سچائی ظاہر ہوئی۔

وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ کی تشریح

اس آیت سے تصدیق کے معنے بالکل واضح ہو
جاتے ہیں کیونکہ یہ زبانی تصدیق کہ تورات سچی ہے کفار مکہ
پر کیا اثر کرسکتی تھی وہ قرآن اور تورات دونوں کو جھوٹا سمجھتے
تھے کفار مکہ پر وہی تصدیق حجت ہوسکتی تھی جس میں کسی پیشگوئی
کے پورا ہونے کا ذکر ہو کیونکہ پیشگوئی خواہ کسی نبی کی ہو چونکہ
علم غیب پر مشتمل ہوتی ہے ہر ایک شخص پر حجت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں
تصدیق کے معنے پیشگوئی پورا کرنے کے سوا اور کوئی ہو ہی
نہیں سکتے اور یہی معنی ہیں جو مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ والی
آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات میں استعمال ہوئے ہیں
وَلَا تَكُونُوٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ۔ اس جملہ کا پہلا حصہ جمع
ہے اور دوسرا مفرد یعنی لَا تَكُونُوٓا کے معنے ہیں کہ اے
بنی اسرائیل تم نہ بنو اور اس کا جواب کہ کیا نہ بنو یہ دیا ہے کہ
اوّل کافر نہ بنو اور کافر مفرد ہے اُردو کے لحاظ سے تو اس پر
کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اردو میں ایسے موقعہ پر مفرد کا لفظ
ہی استعمال کرتے ہیں لیکن عربی کے محاورہ کے مطابق یہ قابلِ
اعتراض ہے کیونکہ عربی میں اس جگہ جمع کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
عربی کے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب افعل التفضیل
کا صیغہ استعمال ہو جیسا کہ اوّل کا لفظ ہے اور وہ کسی ایسے
نکرہ کی طرف مضاف ہو جو صفت کا صیغہ ہو جیسا کہ کافر کا لفظ
ہے تو اس وقت اس نکرہ کو جو صفت کا صیغہ ہو مفرد لانا بھی
جائز ہے اور جمع لانا بھی جائز ہے اور اس کی مثال کے طور پر
فراء نے ایک شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ ؎

وَاِذَا هُمُ طَعِمُوْا فَاَلْأَمُ طَاعِمٍ
وَاِذَا هُمُ جَاعُوْا فَشَرُّ جِيَاعٍ

یعنی جب وہ قوم کھاتی ہے تو کھانے والوں میں سے سب سے بُری
ہوتی ہے اور جب وہ بھوکی ہوتی ہے تو بھوکوں میں سے بدترین
ہوتی ہے۔ اس شعر میں پہلے مصرعہ میں طَاعِمٍ کافر کی طرح مفرد
آیا ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں جِيَاعٍ جمع کا صیغہ آیا ہے گویا
ایک ہی شعر میں دونوں طرح کا محاورہ استعمال ہو گیا ہے۔

جب صفت نکرہ افعل التفضیل کا مضاف الیہ ہو تو فرّاء
کے نزدیک مَنْ کے بعد فعل استعمال کرکے اس کے معنے کئے
جاتے ہیں مثلاً اس شعر میں طَاعِمٍ کے معنے مَنْ طَعِمَ کئے
جائینگے اور آیت میں کافر کے معنے مَنْ كَفَرَ کئے جائیں گے
بعض دوسرے نحویوں نے کہا ہے کہ اس صورت میں یہ توجیہہ

ہوگی کہ اوّل فریق کافر بہ یعنی ابتدا ہی میں کفر کرنے والے گروہ میں شامل نہ ہو بعض دوسروں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ وَلَا یَکُنْ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ تم میں سے ہر ایک اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنے سیبویہ امام لغت کہتے ہیں کہ ایسے موقعہ پر مفرد نکرہ جمع کے معنے دیتا ہے اور اس جملہ کی ترکیب یوں ہے لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرِیْنَ بِہٖ اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنو (بحر محیط زمخشری) اس کے یہ معنے نہیں کہ پہلے کافر نہ بنو ہاں دوسروں کے بعد بیشک کفر کرو۔ یہ عربی کا محاورہ ہے کہ ایک حصہ جملہ کا بیان کردیتے ہیں اور دوسرا چھوڑ دیتے ہیں اسے وہ تحسین کلام میں سے سمجھتے ہیں اس کے رو سے جملہ یہ ہوگا کہ لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ وَلَا تَکُوْنُوْا اٰخِرَ کَافِرٍ بِہٖ یعنی نہ اس کے کفر میں جلدی کرو اور نہ بعد میں کفر کرو۔ اس کی مثال مفسرین اس شعر سے دیتے ہیں ؎

مِنْ اُنَاسٍ لَیْسَ فِیْ اَخْلَاقِہِمْ
عَاجِلُ الْفُحْشِ وَلَا سُوْءُ جَزَعٍ

وہ شخص ایسے لوگوں میں شامل ہے جن کے اخلاق میں نہ تو فحش میں جلدی کرنا شامل ہے اور نہ سخت گھبرانا۔ وہ کہتے ہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ فورًا فحش کو اختیار نہیں کرتا بلکہ دیر سے کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ فحش کو نہ جلدی اختیار کرتا ہے نہ دیر سے (بحر محیط)

میرے نزدیک اس کی ایک اور تشریح بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ جب یہ کتاب تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کی مصدق ہے تو تمہارا اس کتاب کا انکار کرنا اوّل درجہ کا کفر ہوگا کیونکہ جو لوگ جاہل ہیں ان کا انکار نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور انہیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن تم کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ گویا یہ مُراد نہیں کہ چھوٹا کفر جائز ہے یا بعد میں انکار کرنا جائز ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کفر بہرحال ناجائز ہے مگر تمہارا کفر تو اوّل درجہ کا کفر ہے اور زیادہ خطرناک ہے یا یہ کہ تم کو کفار کی اوّل صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ محاورہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (قٓ ع۲) مَیں اپنے بندوں پر بہت بڑا ظلم کرنے والا نہیں ہوں اس کے یہ معنے نہیں کہ میں تھوڑا ظلم کر لیتا ہوں بلکہ یہ معنے ہیں کہ پہلا مضمون جو گذرا ہے اگر اسے تسلیم کیا جائے تو اللہ تعالیٰ بڑا ظالم ثابت ہوتا ہے مگر وہ ایسا نہیں ہے اُردو میں بھی یہ محاورہ مستعمل ہے کہتے ہیں اتنا قہر کیوں توڑتے ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چھوٹا قہر بیشک توڑو بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی پر ظلم کرنا تو ناجائز ہے پھر تم اس قدر بڑا ظلم کیوں کرتے ہو یا یہ کہ جھوٹ بولنا تو ناپسندیدہ ہے پھر تم اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولتے ہو۔

كَافِرٍ بِہٖ میں بِہٖ کی ضمیر کا مرجع

كَافِرٍ بِہٖ میں ہٖ کی ضمیر بِمَآ اَنْزَلْتُ میں جو مَا ہے اس کی طرف بھی جا سکتی ہے اس صورت میں اس کے معنے ہونگے کہ خدا تعالیٰ کے نئے کلام یعنی قرآن کریم کے کافر نہ بنو اور لِمَا مَعَکُمْ کے مَا کی طرف بھی جا سکتی ہے اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ یہ قرآن تو تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کو پُورا کرنے والا ہے دوسرے لوگ ان پیشگوئیوں کے مُنکر ہوں تو ہوں تم کیوں دوسروں سے بھی جلدی کر کے خود اپنی کتب کی تکذیب کرتے ہو۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ میں ثمن سے مراد دنیا کا سامان

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا میری آیات کو چھوڑ کر تھوڑی قیمت نہ لو۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کے معنوں کو بگاڑنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض مُلّا چار پانچ آنہ والا قرآن خرید کر دیہاتیوں کے ہاتھوں میں دو چار روپیہ کو فروخت کرتے ہیں اور کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ میری آیات کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو مُردوں پر جو ختم کئے جاتے ہیں ان میں بھی اسی بیہودہ خیال پر بناء رکھ کر قرآن بخشا جاتا ہے یہ سب بیہودہ خیالات ہیں اور اس آیت کے یہ معنی

بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ

باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ ۹۴۳ اور

نہیں ہیں اگر اس آیت کے یہ معنے ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے وَلَا تَشْتَرُوْا اٰيٰتِیْ بِثَمَنٍ قَلِيْلٍ کیونکہ عربی محاورہ کے مطابق ب قیمت پر آیا کرتی ہے پس تھوڑی قیمت لینی مراد ہوتی تو ب ثمن پر آتی مگر ب ثمن پر نہیں بلکہ آیات پر آئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اشتراءُ کا لفظ خرید و فروخت کے معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوا بلکہ استبدال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (بحر محیط) نوٹ ۹۴۱ میں بتایا جا چکا ہے کہ لغت کے رو سے ایک معنے اشتراء کے یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کو چھوڑ دیا اور دوسری کو لے لیا لغت میں لکھا ہے وَكُلُّ مَنْ تَرَكَ شَيْئًا وَتَمَسَّكَ بِغَيْرِهٖ فَقَدِ اشْتَرَاهُ (اقرب) یعنی جو شخص ایک چیز کو ترک کر دے اور دوسری کو اختیار کرے اس کے لئے بھی اشتراء کا لفظ عربی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں یہی معنے ہیں اور یہ مطلب نہیں کہ میری آیات دے کر تھوڑا مال نہ لو بلکہ یہ معنے ہیں کہ میری آیات کو نہ چھوڑو اور تھوڑے مال کو اختیار نہ کرو تھوڑے مال سے مراد دُنیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (نساء ع ۱۱) دنیا کا سب سامان تھوڑا ہے پس مراد یہ ہے کہ دین چھوڑ کر دُنیا کو اختیار نہ کرو۔ اس میں بنی اسرائیل کو زجر کی ہے کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرنے سے انکار کرنا باوجود اسکے کہ تمہاری کتب میں ان کی پیشگوئیاں موجود ہیں محض اپنی لیڈری کے کھوئے جانے کے خوف سے ہے تم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا گراں گذرتا ہے اور ان کی مخالفت کرکے اپنی قوم کی سرداری قائم رکھنا زیادہ عزیز ہے گویا دنیا کی معمولی عزت اور تھوڑے سے پیسوں کے لئے تم ان پیشگوئیوں کو ترک کر رہے ہو جو تمہاری کتب میں موجود ہیں۔

یہود کا محض دنیا کی خاطر آنحضرت کا انکار کرنا۔

حدیثوں میں آتا ہے دو یہودی عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے واپس جاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ نبی وہی ہے جس کا ذکر ہماری کتب میں آتا ہے لیکن ماننا تو نہیں کیونکہ ہماری جماعت کے لوگ ہمیں قتل کر دیں گے یہی ذہنیت ہے جو اکثر لوگوں کو سچائی سے محروم کر دیتی ہے۔

(مسند احمد حنبل جلد رابع ص ۲۳۹)

وَاِيَّایَ فَاتَّقُوْنِ۔ اس فقرہ کی بناوٹ بھی وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ کی طرح ہے (دیکھو نوٹ ۹۴۱ سورۃ ہذا) اور یہ پورا جملہ یوں ہوتا ہے وَاتَّقُوْا اِيَّایَ تَنَبَّهُوْا فَاتَّقُوْنِ مجھ سے ڈرو ہوشیار ہو جاؤ اور مجھ سے ڈرو اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دُنیا کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ زندگی میں تکلیف سے ڈرتا ہے مگر یہ ڈر عبث ہے کیونکہ تکلیف اور آرام خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے پس دُنیا کا آرام بھی خدا تعالیٰ کو خوش کرکے مل سکتا ہے اسے چھوڑ کر نہیں مل سکتا۔

۹۴۳ حل لغات:۔ لَا تَلْبِسُوْا نہی جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور لَبَسَ عَلَيْهِ (يَلْبِسُ) الْاَمْرَ لَبْسًا کے معنے ہیں خَلَطَهٗ وَجَعَلَهٗ مُشْتَبِهًا بِغَيْرِهٖ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ کے ساتھ ملا کر مشتبہ کر دیا (اقرب) پس لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے معنے ہونگے کہ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔

لَا تَلْبِسُوْا

اَلْحَقُّ:۔ اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۹۲۷

اَلْحَقُّ

اَلْبَاطِلُ:۔ اَلْبَاطِلُ نَقِيْضُ الْحَقِّ وَهُوَ مَا لَا ثَبَاتَ لَهٗ عِنْدَ الْفَحْصِ۔ یعنی باطل حق کے مقابل پر

اَلْبَاطِلُ

بولا جاتا ہے اور باطل اس چیز پر بولتے ہیں جس کی تحقیق کی جائے تو کوئی حقیقت نہ نکلے (مفردات)

تفسیر۔ تَلْبِسُوْا لَبَسَ سے بنا ہے۔ لَبَسَ ضَرَبَ یَضْرِبُ کے وزن پر بھی آتا ہے اور عَلِمَ یَعْلَمُ کے وزن پر بھی۔ جب یہ ضَرَبَ یَضْرِبُ کے وزن پر ہو تو اس کے معنے کسی چیز کو مخلوط کر کے مشتبہ کر دینے کے ہوتے ہیں اور جب عَلِمَ یَعْلَمُ کے وزن پر ہو تو اس کے معنے پہننے کے ہوتے ہیں۔ لباس اسی میں سے بنا ہے اس آیت میں چونکہ تَلْبِسُوْا ہے یعنی ب کے نیچے زیر ہے اس لئے اس کے معنے مخلوط کر کے مشتبہ بنا دینے کے ہیں اور آیت کا یہ ترجمہ ہے کہ حق میں باطل ملا کر اسے مشتبہ نہ بنا دو۔ انبیاء کے دشمن ہمیشہ یہی طریق اختیار کرتے ہیں یعنے کوئی سچی بات لی اور اس میں ایک جھوٹ ملا دیا اور شور مچا دیا کہ مدعی کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہود سب علامتوں کو تسلیم کر کے کبھی کہدیتے کہ اصل علامت آنے والے کی یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہو گا کبھی کہدیتے کہ اصل علامت یہ ہے کہ وہ یروشلم میں ظاہر ہو گا اس طرح عوام کو سچ قبول کرنے سے محروم کر دیتے ہیں حالانکہ صداقت کے پہچاننے میں اصل چیز جسے مدنظر رکھا جاتا ہے یہ ہے کہ موعود اس غرض کو پورا کرتا ہو جس کے لئے اسکی خبر دی گئی تھی اس زمانہ میں ظاہر ہو جس میں اس کے ظہور کی سب سے زیادہ ضرورت ہو اور کچھ حصہ پیشگوئیوں کا ظاہر میں اس کے حق میں پورا ہو جائے ورنہ پیشگوئیوں میں چونکہ اخفاء کو مدنظر رکھا جاتا ہے کچھ حصہ ان کا تعبیر طلب ہوتا ہے بیشک بعض جگہ بنی اسرائیل میں سے اس نبی کے آنے کی خبر ہے مگر چونکہ دوسری جگہ بنو اسمٰعیل میں سے ہونے کی خبر ہے اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ اسکی قوم بنی اسرائیل کی برکات کی وارث ہو گی اور گویا آیندہ زمانہ میں وہ بنی اسرائیل کی قائم مقام ہو گی۔ اور صیحون میں اس کے ظاہر ہونے کے الفاظ بیشک آتے ہیں لیکن اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جس جگہ وہ ظاہر ہو گا وہ بھی خدا تعالیٰ کے مقدس مقامات میں سے ہو گا یعنی مکہ۔ بہت سی دوسری علامات کے حرف بہ حرف پورا ہو جانے کے بعد اور سب سے زیادہ یہ کہ اس زمانہ میں ظاہر ہونے کے بعد جس میں کہ اس موعود کو ظاہر ہونا چاہیئے تھا اور وہ کام کرنے کے بعد جو اس کے لئے مقدر تھا پھر بنی اسرائیل کا یہ اعتراض کہ فلاں فلاں پیشگوئی ابھی پوری نہیں ہوئی یا لفظاً پوری نہیں ہوئی محض حق اور باطل کو ملانے والی بات تھی اور لوگوں کو حق کے قبول کرنے سے روکنے کی ایک ناواجب کوشش۔ مگر ایسی کوششیں نہ پہلے کبھی کامیاب ہوئی تھیں نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہوئیں اور نہ آئیندہ کبھی ہونگی۔

انبیاء کے مخالفین کا سچی باتوں کے ساتھ جھوٹی باتیں ملا کر انبیاء کے دعویٰ کو جھٹا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرنا۔

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ۔ اس جملہ کا پہلے جملہ پر عطف ہے اس لئے وہی لَا۔ جو پہلے گذر چکا ہے دوبارہ دہرایا جائیگا اور جملہ یوں ہو گا وَلَا تَكْتُمُوا الْحَقَّ۔ اور تم حق کو نہ چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی دوسری شرارت بتائی وہ ان پیشگوئیوں کے چھپانے کی کوشش کرتے تھے جن سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہوتی تھی۔ گویا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح مقابلہ کرتے تھے۔ اوّل اس طرح کہ پیشگوئیوں کو مخلوط کر کے بیان کر دیتے تھے مثلاً لفظاً پورا ہونے والی پیشگوئیوں سے تعبیری پیشگوئیوں کو ملا دیتے تھے یا موعود آخر الزمان کی پیشگوئیوں کے ساتھ بعض سابق نبیوں کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں انہیں ملا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بھی آنے والے کی علامت ہے حالانکہ وہ کسی اور نبی کی علامت ہوتی تھی اور اس کے وجود میں پوری ہو چکی تھی (اسی طرح آجکل بعض علمائے اسلام کرتے ہیں اسلام نے بہت سے مہدیوں کی خبر دی ہے بعض آچکے اور اپنے متعلق پیشگوئیوں کو پورا کر چکے۔ مگر یہ علماء آنے والے مہدی کے بارہ میں ان پیشگوئیوں کو بتا کر ان پیشگوئیوں کو مشتبہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے بارہ میں ہیں اور پہلے زمانہ میں پوری ہو چکی ہیں) دوسرا حربہ وہ یہ استعمال کرتے تھے کہ بعض پیشگوئیوں کو عوام کی نظر سے پوشیدہ رکھنے

تَكْتُمُوا الْحَقَّ کی تشریح۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ○

نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کی خالص پرستش کرنے والوں کے ساتھ مل کر خدا ہی کی خالص پرستش کرو ۳۴۴

کی کوشش کرتے تھے اور ان کا ذکر اپنے وعظوں میں چھوڑ جاتے تھے اور اگر مسلمان انہیں بیان کرتے تو صاف انکار کر دیتے تھے اگر کوئی واقف آدمی ان کو مجبور کر دیتا تو بہانے تراشنے لگ جاتے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کی تشریح۔ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ درانحالیکہ تم جانتے ہو یعنی یہ حق و باطل کو ملانا اور بعض حق کو چھپانا اتفاقی حادثہ نہیں اور نہ غلطی کی وجہ سے ہے بلکہ تم ایسا دیدہ و دانستہ کرتے ہو اور جو دیدہ و دانستہ ایسے گناہ کا مرتکب ہو ہرگز خدا تعالیٰ کے فضل کا وارث نہیں ہو سکتا۔

اَقِيْمُوا ۴۴ **حل لغات**:۔ اَقِيْمُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اَقَامَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴ ع

اَلصَّلٰوة اَلصَّلٰوةُ۔ اَلصَّلٰوةُ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴ ع

اَلزَّكٰوة اَلزَّكٰوةُ:۔ زَكَا (يَزْكُوْا) تَزْكِيَةً کا اسم ہے اور زَكَى الشَّيْءُ کے معنے ہیں نَمَا کوئی چیز زیادہ اور بکثرت ہوگئی۔ کہتے ہیں زَكَا الرَّجُلُ۔ صَلَحَ وَتَنَعَّمَ وَكَانَ فِیْ خَصْبٍ۔ کوئی شخص اچھی عمدہ حالت میں ہو گیا۔ خوشحالی میں ہو گیا (کیونکہ زَكَتِ الْاَرْضُ اس وقت بولتے ہیں جبکہ وہ سرسبز ہو جائے) اور جب زَكَّاهُ اللّٰهُ کہیں تو اس کے معنے ہونگے اَنْمَاهُ اللہ تعالیٰ نے اس کو پروان چڑھایا۔ طَهَّرَهٗ اسے پاکیزہ کیا۔ زَكّٰى فُلَانٌ مَالَهٗ کے معنے ہیں اَدّٰى عَنْهُ زَكٰوةً اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کی اور جب زَكّٰى نَفْسَهٗ کہیں تو معنے ہونگے کہ مَدَحَهَا اپنے نفس کو اس نے تعریف کے قابل بنایا اور تَزَكّٰى کے معنے ہیں تَصَدَّقَ اس نے صدقہ دیا اور اَلزَّكٰوةُ کے معنے ہیں صَفْوَةُ الشَّيْءِ اعلیٰ درجہ کی چیز طَاعَةُ اللّٰهِ اللہ کی اطاعت۔ مَا اَخْرَجْتَهٗ مِنْ مَالِكَ لِتُطَهِّرَهٗ بِهٖ۔ مال کا وہ حصہ جو بطور زکوٰۃ نکالا جاتا ہے تاکہ باقی مال پاک ہو جائے۔ وَقِيْلَ سُمِّيَتِ الصَّدَقَةُ بِالزَّكٰوةِ لِاَنَّهَا تَزِيْدُ فِی الْمَالِ الَّذِیْ تُخْرَجُ مِنْهُ وَتُوَفِّرُهٗ وَتَقِيْهِ مِنَ الْاٰفَاتِ۔ اور صدقہ کا نام اس لئے زکوٰۃ رکھا گیا ہے کیونکہ جس مال سے زکوٰۃ نکالی جائے وہ اس مال میں برکت ڈالتی ہے اور اس کو بڑھاتی ہے اور اُسے آفات سے بچاتی ہے (اقرب)

اِرْكَعُوْا اِرْكَعُوْا:۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور رَكَعَ الْمُصَلِّیْ (رَكْعًا وَرُكُوْعًا) کے معنے ہیں طَاْطَاَ رَاْسَهٗ۔ نمازی نے اپنا سر نیچے کیا اور جب رَكَعَ اِلَی اللّٰهِ کہیں تو معنے ہونگے اِطْمَاَنَّ اِلَيْهِ اس نے اللہ کی طرف تسلی پائی۔ نیز رَكَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں اِنْحَطَّتْ حَالَتُهٗ وَافْتَقَرَ اس کی مالی حالت کمزور ہو گئی اور وہ محتاج ہو گیا (یہ مجازی معنے ہیں) اور رَكَعَ الْمُصَلِّیْ فِی الصَّلٰوةِ رُكُوْعًا کے معنے ہیں خَفَضَ رَاْسَهٗ بَعْدَ قَوْمَةِ الْقِرَاءَةِ حَتّٰى تَنَالَ رَاحَتَاهُ رُكْبَتَيْهِ اَوْ حَتّٰى يَطْمَئِنَّ ظَهْرُهٗ۔ نمازی نے قراءت کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کمر کو جھکایا نیز لکھا ہے وَالرَّاكِعُ كُلُّ شَيْءٍ يَخْفِضُ رَاْسَهٗ اور ہر اس چیز پر جو سر نیچے جھکائے رکھتی ہے رَاكِع کا لفظ بولتے ہیں (اقرب) مفردات میں ہے اَلرُّكُوْعُ اَلْاِنْحِنَاءُ کہ رکوع کے معنے جھک جانے کے ہیں فَتَارَةً يُسْتَعْمَلُ فِی الْهَيْئَةِ الْمَخْصُوْصَةِ فِی الصَّلٰوةِ وَتَارَةً فِی التَّوَاضُعِ وَالتَّذَلُّلِ اِمَّا فِی الْعِبَادَةِ وَاِمَّا فِیْ غَيْرِهَا کبھی تو یہ لفظ اس مخصوص ہیئت پر استعمال کیا جاتا ہے جو نماز میں کی جاتی ہے۔ یعنی قرأت کے ختم کرنے کے بعد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک جانا اور کبھی یہ لفظ عاجزی کرنے اور تذلل اختیار کرنے پر بولا

جاتا ہے خواہ یہ عاجزی نماز میں کی جائے یا اس کے علاوہ کسی اور حالت یا مقام میں (مفردات) تاج العروس میں ہے کُلُّ شَیْءٍ یَنْکَبُّ لِوَجْھِہٖ فَتَمَسُّ رُکْبَتُہُ الْاَرْضَ اَوْلَا تَمَسُّھَا بَعْدَ اَنْ یَخْفِضَ رَأْسَہٗ فَھُوَ رَاکِعٌ کہ ہر اس چیز پر جو اوندھے مُنہ ہو کر جھکتی ہے رَاکِعٌ کا لفظ بولتے ہیں (گویا اسکی ہیئت کذائی عاجزی پر دلالت کرتی ہے) وَقَالَ ثَعْلَبٌ اَلرُّکُوْعُ اَلْخُضُوْعُ لغت کے مشہور امام ثعلب کہتے ہیں کہ رکوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں وَکَانَتِ الْعَرَبُ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ تُسَمِّی الْحَنِیْفَ رَاکِعًا اِذَا لَمْ یَعْبُدِ الْاَوْثَانَ وَیَقُوْلُوْنَ رَکَعَ اِلَی اللّٰہِ اور عرب لوگ قبل اسلام مُوَحِّد کو راکع کہتے تھے کیونکہ وہ بُتوں کی پوجا نہ کرتا تھا اور اس کے لئے راکع کا لفظ اس لئے استعمال کرتے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی اور اس کے سامنے عاجزی اختیار کی (تاج) الغرض رَکَعَ کے لفظ کے اندر عاجزی اور تذلل کے معنے پائے جاتے ہیں پس رَاکِعٌ کے معنے ہونگے (۱) عاجزی کرنے والا (۲) اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرنے والا۔ اور اِرْکَعُوْا کے معنے ہونگے تم عاجزی کرو۔ (۲) تم اللہ تعالیٰ کی خالص پرستش کرو۔

تفسیر۔ پہلی آیات میں ایمان کی درستی کی بنی اسرائیل کو ہدایت کی تھی اب اعمال کی درستی کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرماتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر اپنے ایمان کی تکمیل تمہارے لئے ضروری ہے اسی طرح آپ پر ایمان لا کر اپنے اعمال کی درستی تمہارے لئے ضروری ہے بیشک تم اپنے رنگ میں عبادت کرتے ہو مگر اب وہ عبادت تمہاری مقبول نہیں۔ اب تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کے مطابق نمازیں پڑھوگے تو عبادت قبول ہوگی۔ اسی طرح بیشک تم قومی چندے دیتے ہو مگر اب تو شریعت محمدیہ کے مطابق زکوٰۃ نہ دوگے تو خدا تعالیٰ کی رضا حاصل نہ کرسکوگے اسی طرح بیشک تمہاری عبادات اور تمہارے اعمال شرک سے ایک حد تک پاک ہونگے مگر اب وہ معیار توحید کا جو پہلے تھا بدل گیا ہے اب تو اس وقت تک تم خدا تعالیٰ کے فضلوں کے وارث نہیں ہوسکتے جب تک اس معیار توحید کو قائم نہ کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے

اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کی تشریح۔

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں زکوٰۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ ایک مقررہ طریق پر اپنے اموال کو خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا ہے زکوٰۃ کے بارے میں آگے چلکر تفصیلی بحث ہوگی اسی سلسلہ میں نوٹ ۳۵ سورہ ہذا بھی دیکھ لینا چاہئے جس میں اسلامی ذمہ داریاں مال کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ میں لفظ رَکَعَ کے معنے موحد کے۔

وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۔ میں جو لفظ رَکَعَ استعمال ہوا ہے اس کے بارہ میں حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنے علاوہ رکوع یعنی جھکنے کے موحدانہ زندگی بسر کرنے کے بھی ہوتے ہیں حقیقت الاساس میں لکھا ہے کَانَتِ الْعَرَبُ تُسَمِّی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَلَمْ یَعْبُدِ الْاَوْثَانَ رَاکِعًا۔ یعنی عرب لوگ اسے جو اللہ پر ایمان لاتا ہو۔ اور بتوں کی پوجا نہ کرتا ہو رَاکِعٌ کہتے ہیں اسی طرح لسان العرب میں لکھا ہے کہ رَاکِعٌ توجہ کو خالص ایک طرف کردینے والے کو کہتے ہیں اور اسکی تائید میں نابغہ ذبیانی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

سَیَبْلُغُ عُذْرًا اَوْ نَجَاحًا مِنِ امْرِئٍ
اِلٰی رَبِّہٖ رَبِّ الْبَرِیَّۃِ رَاکِعٌ

یعنی وہ شخص جو صرف اپنے رب کی طرف جو سب دُنیا کا رب ہے خالص طور پر متوجہ ہو جاتا ہے ضرور یا نجات پا جائے گا یا معذور قرار پا جائے گا۔

آیت ہذا میں بنی اسرائیل کو اعمال کی درستی کی توجہ دلائی گئی ہے

پس وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ کے معنے اس جگہ نماز کے رکوع کے نہیں کیونکہ نماز میں صرف رکوع ہی نہیں ہوتا بلکہ رکوع کے سوا اور اجزاء بھی ہوتے ہیں پس کوئی وجہ نہ تھی کہ صرف رکوع کا ذکر کیا جاتا۔ دوسرے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں نہ صرف خالی نماز کا بلکہ باجماعت نماز کا ذکر ہو چکا ہے جس میں قیام رکوع سجدہ سب ہی شامل ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں

أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ

کیا تم (دوسرے) لوگوں کو (تو) نیکی (کرنے) کے لئے کہتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو

وَأَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَ

حالانکہ تم (اپنی) کتاب پڑھتے ہو۔ پھر (بھی) کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے ۵۴۵ اور

کہ ساری نماز کا جس میں رکوع بھی شامل ہے ذکر کرکے صرف رکوع کا الگ ذکر کیا جائے۔ پس ان امور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رکوع کے معنے اور ہیں نماز والے رکوع کے نہیں اور وہ معنے میں اوپر بیان کر چکا ہوں پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے کی تلقین کی پھر مسلمانوں کی طرح زکوٰۃ دینے کی تلقین کی پھر یہ حکم دیا کہ مسلمانوں کی طرح اپنے سب اعمال کو خدا تعالیٰ کے لئے کر دو اور کامل توحید کو اختیار کرلو شرک کی ملونی کو اپنے اعمال سے بالکل جدا کر دو تب جا کر تم ان فضلوں کے دوبارہ وارث ہو سکو گے جن کا وعدہ عہدِ ابراہیم میں بیان ہوا ہے۔

اس تشریح کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ تا کوئی یہ دھوکا نہ کھائے کہ یہود کے لئے تورات کے احکام پر عمل کرنا اب بھی کافی ہے اور یہ امر واضح ہو جائے کہ اب عمل صالح سے مراد وہی عمل ہوگا جو شریعت محمدیہ میں نازل ہوا ہے اور اسی صورت میں مقبول ہوگا کہ اسلامی طریق کے مطابق ادا کیا جائے۔

اَلْبِرُّ

۵۴۵ حل لغات۔ اَلْبِرُّ۔ اَلصِّلَةُ۔ انعام احسان اور عطیہ۔ اَلطَّاعَةُ فرمانبرداری۔ اَلصِّدْقُ سچائی (اقرب) تاج العروس میں ہے اَصْلُ مَعْنَى الْبِرِّ اَلسَّعَةُ کہ بِرّ کے اصل معنے وسعت کے ہوتے ہیں ثُمَّ شَاعَ فِي الشَّفَقَةِ وَالْاِحْسَانِ وَالصِّلَةِ پھر یہ لفظ شفقت۔ احسان اور انعام عطیہ وغیرہ کے معنوں میں مشہور ہو گیا۔ ابو منصور جو لغت کے امام ہیں کہتے ہیں کہ اَلْبِرُّ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ بِرّ کے لفظ کے اندر دنیا و آخرت ہر دو کی بھلائیاں آجاتی ہیں۔ نیز اَلْبِرُّ کے معنے ہیں اَلصَّلَاحُ صلاحیت۔ اَلْخَيْرُ بھلائی۔ اَلْاِتِّسَاعُ فِي الْاِحْسَانِ اِلَى النَّاسِ۔ لوگوں کے ساتھ احسان کرنے میں وسعت (تاج العروس)

تَنْسَوْنَ

تَنْسَوْنَ۔ نَسِيَ (يَنْسٰى) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور نَسِيَ الشَّيْءَ نَسْيًا کے معنے ہیں ضِدُّ حَفِظَهٗ کسی چیز کو بھول گیا۔ قَالَ الرَّاغِبُ "اَلنِّسْيَانُ تَرْكُ الْاِنْسَانِ ضَبْطَ مَا اسْتُوْدِعَ اِمَّا لِضَعْفِ قَلْبِهٖ وَاِمَّا عَنْ غَفْلَةٍ وَاِمَّا عَنْ قَصْدٍ حَتّٰى يَنْحَذِفَ عَنِ الْقَلْبِ ذِكْرُهٗ" امام راغب لکھتے ہیں کہ انسانی دماغ میں جو باتیں محفوظ ہوں ان کو اس کا ضائع کر دینا نسیان کہلاتا ہے خواہ یہ ضائع کرنا اس کی دماغی کمزوری کا نتیجہ ہو خواہ غفلت کی وجہ سے ہو یا ارادۃً ہو حتیٰ کہ ان باتوں کا نقش ذہن سے مٹ جاوے (اقرب) تاج العروس میں لفظ نسیان کی تشریح میں لکھا ہے اَكْثَرُ اَهْلِ اللُّغَةِ فَسَّرُوْهُ بِالتَّرْكِ۔ کہ اکثر اہل لغت نے نسیان کے معنے چھوڑنے کے کئے ہیں پھر امام ثعلب جو عربی لغت کے مشہور امام ہیں ان کا قول آیت نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ کی تشریح میں لکھا ہے کہ لَا يَنْسَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّمَا مَعْنَاهُ تَرَكُوا اللّٰهَ فَتَرَكَهُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ وہ کسی چیز کو بھول جائے۔ اس لئے آیت نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ میں نسیان کے معنی چھوڑنے کے ہیں یعنی لوگوں نے خدا تعالیٰ کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو چھوڑ دیا (تاج) پھر لکھا ہے وَاِذَا اُنْسِبَ ذٰلِكَ

اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا

صبر اور دُعا کے ذریعہ سے (اللہ سے) مدد مانگو اور بے شک فروتنی اختیار

اِلَى اللّٰهِ فَهُوَ تَرْكُهٗ اِيَّاهُمْ اِسْتِهَانَةً وَمُجَازَاةً لِمَا تَرَكُوْهُ۔ جب لفظ نسیان اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے چھوڑنے کے ہوتے ہیں کیونکہ جب لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اُسکے احکام سے رُوگردانی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ایسے اعمال کے بدلہ میں ان کو چھوڑ دیتا ہے (تاج) اقرب میں لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں لَا تَقْصُدُوا التَّرْكَ وَالْاِهْمَالَ کہ اپنی فضیلت کو چھوڑنے کا قصد نہ کرو (اقرب) پس تَنْسَوْنَ کے معنے ہونگے تم بھلاتے ہو فراموش کرتے ہو۔ تم چھوڑتے ہو۔

اَنْفُسَكُمْ:۔ اَنْفُسٌ نَفْسٌ کی جمع ہے اور اَلنَّفْسُ کے معنے ہیں اَلرُّوْحُ۔ رُوح۔ اَلْجِسْمُ جسم وَيُرَادُ بِالنَّفْسِ الشَّخْصُ وَالْاِنْسَانُ بِجُمْلَتِهٖ بعض اوقات نفس کا لفظ بولکر رُوح اور جسم کا مجموعہ انسان اور اس کا خاص تشخص مراد لیا جاتا ہے۔ اَلْعَظَمَةُ عظمت اَلْعِزَّةُ عزت۔ اَلْهِمَّةُ ہمت۔ اَلْاِرَادَةُ۔ ارادہ اَلرَّاْيُ رائے (اقرب)

تَتْلُوْنَ:۔ تَلَا (يَتْلُوْ) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تَلَا الْكَلَامَ تِلَاوَةً کے معنے ہیں قَرَاَهٗ کسی کلام کو پڑھا (اقرب) پس تَتْلُوْنَ کے معنے ہونگے تم پڑھتے ہو۔

تَعْقِلُوْنَ:۔ عَقَلَ (يَعْقِلُ) سے مضارع مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور عَقَلَ الدَّوَاءُ الْبَطْنَ کے معنے ہیں اَمْسَكَهٗ دوائی نے پیٹ کو روک دیا یعنی قبض کر دی اور جب عَقَلَ الْغُلَامُ کہیں تو معنے ہوں گے اَدْرَكَ لڑکا بالغ ہو گیا یعنی اچھی اور بُری باتوں کو سمجھنے لگ گیا اور عَقَلَ الشَّيْءَ عَقْلًا کے معنے ہیں فَهِمَهٗ وَ تَدَبَّرَهٗ کسی چیز کو سمجھا اور اس کے متعلق غور و فکر کیا عَقَلَ الْبَعِيْرَ:۔ ثَنٰى وَظِيْفَهٗ مَعَ ذِرَاعِهٖ فَشَدَّهُمَا مَعًا بِحَبْلٍ اُونٹ کی ٹانگ کو اسکی ران کے ساتھ باندھ دیا عَقَلَ الْوَعْلُ عَقْلًا کے معنے ہیں صَعِدَ وَامْتَنَعَ فِي الْجَبَلِ الْعَالِيْ پہاڑی بکرا پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہاں جا کر رُک کر محفوظ ہو گیا۔ نیز اَلْعَقْلُ کے معنے ہیں نُوْرٌ رُوْحَانِيٌّ بِهٖ تُدْرِكُ النَّفْسُ الْعُلُوْمَ الضَّرُوْرِيَّةَ وَالنَّظَرِيَّةَ کہ عقل اس روحانی روشنی کا نام ہے جس کے ذریعہ سے نفس بدیہی باتوں کو یا غور و فکر سے معلوم ہونے والی باتوں کو معلوم کرتا ہے (اقرب)

پس اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے معنے ہونگے (۱) کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے (۲) کیا تم اپنی ناواجب حرکات سے رُکتے نہیں۔ اَنْفُسَكُمْ

تفسیر۔ بِرٌّ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں لکھا جا چکا ہے اعلیٰ درجہ کے احسان اور نیکی کے ہوتے ہیں اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ بنی اسرائیل اپنی کتب کے حکم کے مطابق لوگوں کو بہت احسان کرنے اور نیکی کرنے کا حکم دیتے تھے لیکن اپنا یہ حال تھا کہ خدا تعالیٰ کی تَتْلُوْنَ
طرف سے آنے والے عظیم الشان نبی کو صرف دنیوی نقصان کے ڈر کے مارے قبول نہ کرتے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو تو اپنی جانوں کو بھی تو نہ بھولو ان کا حق تو تم پر زیادہ ہے نسیان کے معنے چھوڑنے کے بھی ہیں تَعْقِلُوْنَ
اس کے رو سے یہ معنی ہونگے کہ لوگوں کو اعلیٰ نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو چھوڑ دیتے ہو انہیں ایسا حکم کیوں نہیں دیتے کہ تمہارا عمل تمہارے قول کے خلاف نہ ہو۔

وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کے یہ معنے نہیں کہ تمہاری کتاب محرف مبدل نہیں جیسا کہ بعض ناواقف

عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا

کرنیوالوں کے سوا (دوسروں کے لئے) یہ (امر) مشکل ہے ۴۶ جو (اس بات پر) یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے

تیجہ نکالتے ہیں بلکہ کتاب کا ذکر پہلے حکم کے سلسلہ میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم تو اپنی کتاب پڑھتے ہو اس میں تو یہ حکم نہیں کہ دوسروں کو تو نیکی کا حکم دو اور اپنے آپ کو بدراہ پر چلاؤ پس جب تم جس کتاب کو مانتے ہو وہ بھی اس طریق کو جائز نہیں قرار دیتی تو تم نے اس طریق کو کیوں اختیار کر رکھا ہے چاہیئے کہ جس طرح دوسروں کو قربانی کا حکم دیتے ہو خود بھی حق کے لئے قربانی کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

(حاشیہ: اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ کے یہ معنے نہیں کہ تورات غیر محرف ہے۔)

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ اور پھر کیا تم باز نہیں آتے یعنی اگر تمہاری کتب میں یہ تعلیم نہ ہوتی کہ اپنے نفس کو بھی نیکی کی راہ پر چلاؤ تو تم کو معذور سمجھا جا سکتا تھا لیکن اس تعلیم کی موجودگی میں تمہارا نیکی کے راستہ سے بھٹکنا تو سخت افسوسناک ہے پس کسی دوسرے کی نہیں مانتے تو اپنی کتاب کے حکم ہی کو مانو اور نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلو۔

(حاشیہ: اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے معنے روکنے کے)

۴۶ حل لغات

اِسْتَعِيْنُوْا: اِسْتَعِيْنُوْا امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور اِسْتِعَانَةٌ کے معنے مدد طلب کرنے یا مدد حاصل کرنے کے ہیں چنانچہ کہتے ہیں اِسْتَعَنْتُهٗ فَاَعَانَنِيْ یعنے اس سے مدد طلب کی تو اس نے مدد دے دی (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو سورہ فاتحہ ۶

اَلصَّبْرُ: صَبْرٌ کے معنی ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دکھ کا شکوہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پہ اعتراض نہ کیا جائے۔ کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ فِي الْمُصِيْبَةِ کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَیْ جَرُؤَ وَشَجُعَ وَتَجَلَّدَ اور صبر جزع یعنی شکوہ کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی جرأت دکھائی ہمت دکھائی اور صَبَرَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رکا رہا۔ صَبَرَ الدَّابَّةَ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ اور جب صَبَرَ کا مفعول دَابَّة کا لفظ ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو چارہ نہ دیا نیز کہتے ہیں صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا۔ حَبَسْتُهَا کہ میں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی چنانچہ محاورہ ہے صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَصَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ یعنے جب صَبَرَ کا صلہ عَلٰى ہو تو اس کے معنے کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں اور جب اس کا صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنے کسی چیز سے رکنے یا کسی کو اس سے روک دینے کے ہوتے ہیں (اقرب) پس صَبْرٌ کے معنے (۱) بدیوں سے رکتے رہنا اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنا (۲) خدا تعالیٰ کے راستہ میں تکلیف پر جزع فزع نہ کرنا۔

اَلصَّلٰوةُ: کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴۴

اَلْخٰشِعِيْنَ: خٰشِعِيْنَ اور خٰشِعُوْنَ خَاشِعٌ کی جمع ہے جو خَشَعَ سے اسم فاعل ہے۔ خَشَعَ کے معنے ذَلَّ وَتَطَاْمَنَ تابعدار ہو گیا اور عاجزی کا اظہار کیا اور خَشَعَ بِبَصَرِهٖ کے معنے ہیں غَضَّهٗ آنکھ نیچے کر لی۔ نِهَايَة میں لکھا ہے کہ اَلْخُشُوْعُ فِي الصَّوْتِ وَالْبَصَرِ كَالْخُضُوْعِ فِي الْبَدَنِ جس طرح بدن کی عاجزی اور کمزوری ظاہر کرنے کے خضوع کا لفظ بولا جاتا ہے اسی طرح آواز کے کمزور ہونے اور آنکھ کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے خشوع کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلْخُشُوْعُ اَلضَّرَاعَةُ

خشوع کے معنے عاجزی کرنے کے ہوتے ہیں وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ الْخُشُوْعُ فِيْمَا يُوْجَدُ عَلَى الْجَوَارِحِ وَالضَّرَاعَةُ اَكْثَرُ مَا تُسْتَعْمَلُ فِيْمَا يُوْجَدُ فِي الْقَلْبِ کہ خشوع کا استعمال اکثر اس عاجزی پر ہوتا ہے جو اعضاء سے ظاہر ہو رہی ہے اور تضرع اکثر دل میں عاجزی پیدا ہو جانے کے متعلق بولا جاتا ہے۔ (مفردات) پس خٰشِعِيْنَ کے معنے ہونگے عاجزی اختیار کرنے والے. فروتنی اختیار کرنے والے۔

تفسیر۔ صداقت کے قبول کرنے میں دو روکیں ہوتی ہیں (۱) حکومت قوم رشتہ داروں اور دوستوں کا دباؤ جو حق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یا ضد تعصب یا خودغرضی کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی قبول نہیں کرنے دیتے (۲) سابق عادات یا گناہوں کا زنگ دل کو مردہ کر دیتا ہے اور ہمت کو سلب کر دیتا ہے۔

اس آیت میں ان دونوں روکوں کی طرف اشارہ کرکے بتایا گیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اگر تم پر حق کھل گیا ہے تو اسے قبول کرنے میں دیر نہ کرو بیشک تم کو تمہارے ہم قوموں اور رشتہ داروں دوستوں کی طرف سے روکا جائے گا تم پر ظلم کیا جائے گا تکلیفیں دی جائینگی مگر ان باتوں کی پروا نہ کرو اور صبر کی پسندیدہ عادت سے اس روک کا مقابلہ کرو دوسرے اپنے دل کو صاف کرنے کے لئے خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرو تا کہ دل کے زنگ دُور ہوں اور تم میں صداقت کو قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہو۔

ایک اور نفسیاتی نکتہ بھی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کسی کام کی درستی کے لئے دو امور کی ضرورت ہوتی ہے **اوّل** بیرونی بداثرات سے حفاظت ہو **دوسرے** اندرونی طاقت کو بڑھایا جائے اس آیت میں صبر کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیرونی بداثرات کا مقابلہ کرو اور صلوٰۃ کے لفظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ سے دُعائیں کرکے اس کے فضلوں کو جذب کرو اس طرح کمزوری کے راستے بند ہونگے اور طاقت کے حصول کے دروازے کُھل جائیں گے اور تم کامیاب ہو جاؤ گے حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ صبر کے معنے صرف جزع فزع سے بچنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ بُرے خیالات کا اثر قبول کرنے سے رُکنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اوپر کی تفسیر میں یہی معنے مُراد ہیں جب کوئی بداثرات کو رد کرے اور نیک اثرات کو قبول کرنے کی عادت ڈالے جو دعاؤں سے حاصل ہو سکتی ہے تو اس کے دل میں روحانیت پیدا ہو کر جو کام پہلے مشکل نظر آتا تھا آسان ہو جاتا ہے اور روحانی ترقی کی جنگ میں اسے فتح حاصل ہوتی ہے۔

صداقت کے ماننے میں دو روکیں اور ان کا حل۔

اگلے جملہ میں جو كَبِيْرَةٌ کا لفظ استعمال ہُوا ہے اس کے معنے بڑی کے ہیں اور اس آیت میں موقعہ کے لحاظ سے مشکل امر کے معنے ہوتے ہیں اور خَاشِع کے معنے ڈرنے والے کے ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ جس جگہ بھی استعمال ہُوا ہے اس ہستی سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے جس سے ڈرنا مناسب ہو چنانچہ خَاشِع کا لفظ سارے قرآن کریم میں یا تو خدا تعالےٰ سے ڈرنے یا اس کے عذاب سے ڈرنے کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔ بندوں یا دوسری چیزوں سے ڈرنے کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہُوا۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ میں کبیرہ کے معنے مشکل امر کے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اس قسم کا علاج بتانا آسان ہے اس پر عمل کرنا مشکل ہے پس اس کا جواب وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ میں دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس علاج پر عمل مشکل کام ہے لیکن جو خَاشِع ہو جائے اس کے لئے مشکل نہیں رہتا گویا گناہوں اور کمزوریوں سے بچنے کا حقیقی علاج خدا تعالیٰ پر ایمان ہے بغیر اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے انسان دوسری تدبیروں سے گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ دُنیا نے بارہا اس کا تجربہ کیا ہے لیکن افسوس کہ وہ بار بار اس نکتہ کو بھول جاتی ہے حقیقی نیکی اور کامل نیکی کبھی بھی خدا تعالےٰ پر کامل یقین کے بغیر نہیں پیدا ہوتی فلسفیانہ دلائل انسان کے اندر سچا تقویٰ نہیں پیدا کر

آیت ہذا میں ایک نفسیاتی نکتہ یعنی کسی کام کی درستی کے لئے دو امور کی ضرورت

ع۵ ۵ ن۸ رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

ہیں اور (اس بات پر بھی) کہ وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۵۷؎ اے بنی اسرائیل

سکتے۔ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان کے بعد جو خوف بدیوں سے پیدا ہوتا ہے وہ اور کسی طرح پیدا نہیں ہوتا اسی وجہ سے انبیاءؑ کی جماعتوں نے جو نیکی اور قربانی کا نمونہ دکھایا ہے وہ اور کوئی جماعت دُنیا کی نہیں دکھا سکتی۔

یَظُنُّوْنَ

اس آیت میں جس محبت اور خیر خواہی سے بنی اسرائیل کو نصیحت کی گئی ہے وہ اس اعلیٰ روح کا جو اسلام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے ایک بین ثبوت ہے لفظ لفظ سے انکی خیر خواہی ٹپکتی ہے اور ان الفاظ کا کہنے والا بنی اسرائیل کو غلطی سے بچانے کا پورا خواہشمند معلوم ہوتا ہے بعض نادان کہتے ہیں کہ یہ کلام محمد رسول اللہ کا ہے اور وہ اس طرح یہودیوں میں اپنے آپ کو مقبول بنانا چاہتے تھے مگر اس آیت کے الفاظ پر غور کرو کیا یہ الفاظ کسی شہرت کے طالب کے ہو سکتے ہیں پھر یہ بھی سوچو کہ بنی اسرائیل نے باوجود اس نصیحت کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت قوم کے نہیں مانا مگر اس سے کس کا نقصان ہوا کیا اسلام کو اس سے کوئی نقصان بھی پہنچا۔ جس وقت یہ نصیحت کی گئی تھی صرف چند سو آدمی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے لیکن اب چالیس کروڑ آدمی آپؐ کا کلمہ پڑھ رہا ہے ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی ہے اور اب پھر ان کی ترقی کے سامان اللہ تعالیٰ پیدا کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل اگر آپ پر ایمان لے آتے تو وہ ان حالات میں اور کیا تبدیلی کر دیتے اگر کچھ فائدہ تھا تو انہی کا تھا۔ ان میں سے لاکھوں مسیحی ہوئے ہیں مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے ملکوں میں سے نکالا جانا۔ جائدادوں کا لوٹا جانا ان کا حصہ ہے اور نہ وہ اِدھر کے رہے ہیں نہ اُدھر کے۔ اگر اسلام لاتے تو آج کروڑوں مسلمانوں کے برابر کے شریک ہوتے اور کوئی ان کو غیر قرار دے کر دُکھ نہ دیتا

آیت ہذا میں بنی اسرائیل کے لئے حد درجہ کی خیر خواہی۔

آیت ماقبل میں لفظ خشوع کے معنے کامل ایمان رکھنے اور ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونے کے متعلق پورا یقین رکھنے کے۔

پس ان حالات کے باوجود مسیحی مصنفوں کا یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کو لالچ دیکر اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقع اعتراض ہے محض بنی اسرائیل کے فائدہ کی ایک بات کہی گئی تھی انہوں نے نہ مانا اور تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔

۵۷؎ **حل لغات**:۔ یَظُنُّوْنَ۔ ظَنَّ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ظَنَّ الشَّیْءَ کے معنے عَلِمَهٗ وَاسْتَيْقَنَهٗ کہ کسی چیز کو معلوم کیا اور اس کے متعلق یقین کر لیا اور اَلظَّنُّ کے معنے کے ماتحت لکھا ہے هُوَ الْاِعْتِقَادُ الرَّاجِحُ مَعَ اِحْتِمَالِ النَّقِيْضِ وَيُسْتَعْمَلُ فِي الْيَقِيْنِ وَالشَّكِّ یعنی ظن کے معنے زیادہ تر خیال غالب کے ہوتے ہیں اور بعض وقت وہ یقین کے معنے میں اور بعض وقت شک کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے (اقرب) اس آیت میں ظن بمعنے یقین کے استعمال ہوا ہے اور یَظُنُّوْنَ کے معنے ہیں وہ یقین رکھتے ہیں۔

تفسیر قرآن کریم کا یہ عام طریق ہے کہ جب کسی لفظ کو خاص معنوں میں استعمال کرتا ہے تو اس اصطلاح کی ساتھ ہی تشریح بھی کر دیتا ہے اس آیت میں بھی قرآنی اصطلاح کے مطابق خَاشِعِيْنَ کے معنے بتائے گئے ہیں خَاشِعٌ چونکہ ڈرنے والے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس جگہ عام ڈرنیوالے کے معنوں میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور ایک دن اُس کے سامنے حاضر ہونے پر انہیں پورا یقین ہے۔

پس خَاشِعِيْنَ کے معنے اوپر کی آیت میں صرف ڈرنے والے کے نہیں کئے جائیں گے بلکہ اس سے مراد وہ شخص لیا جائے گا جس کا خوف خدا تعالیٰ کی ذات پر کامل

اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ

میرے اس احسان کو جو میں تم پر کر چکا ہوں یاد کرو اور (اس احسان کو بھی) کہ میں نے تمہیں

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ

تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی ۵۴۸ اور اس دن سے ڈرو کہ (جس دن) کوئی شخص

یقین سے پیدا ہوتا ہے اور اس خوف کی بناء نقصان کے ڈر پر نہیں بلکہ اس امر پر ہے کہ میں اعلیٰ ترقیات سے محروم نہ رہ جاؤں گویا یہ ڈر ایک بزدل کا ڈر نہیں بلکہ ایک عارف کی گھبراہٹ ہے جو دلیر سے دلیر آدمی میں بھی پائی جاتی ہے اور پائی جانی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہود کو دُنیاوی تکلیفوں سے ڈرنے سے روکتے ہوئے یہ فقرہ استعمال کیا گیا ہے کہ اس ڈر کا دُور کرنا ہے تو مشکل مگر خَاشِعِيْنَ کے لئے مشکل نہیں ڈر کے عام معنوں کے رو سے یہ فقرہ عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی ظاہری شکل یُوں بنتی ہے کہ لوگوں سے ڈرو نہیں بیشک ڈرنے سے بچنا مشکل ہے مگر ڈرنے والوں کے لئے مشکل نہیں۔ مگر جیسا کہ بتایا گیا ہے۔ اَلْخُشُوْعُ کے معنے عام ڈر کے نہیں بلکہ ایک کامل ہستی پر ایمان رکھتے ہوئے قرب سے محروم رہنے کے خوف کے ہیں اور ان معنوں کی رو سے اس فقرہ میں کوئی امر قابلِ تعجب نہیں اور اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ دنیوی مشکلات سے نہ ڈرو یہ بیشک مشکل امر ہے لیکن جو لوگ اپنے لئے ایک اعلیٰ مقصد قرار دے لیں اور اس مقصد کو چھوڑنا ان پر سخت گراں گزرنے لگے ان کے لئے ایسے خطرات برداشت کرنے مشکل نہیں رہتے اس قسم کا ڈر درحقیقت بہادری اور احتیاط کی ایک قسم ہے نہ کہ بُزدلی کا مظاہرہ۔

وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو مابعد الموت زندگی پر اس کے مناسب حال زور دیتا ہے اسلام کے سوا کوئی اور مذہب تقوٰی کی بُنیاد کو بعد الموت زندگی پر نہیں رکھتا۔ اسلام اس دُنیا کی زندگی کو ایک لمبی زندگی کی ایک کڑی قرار دیتا ہے جس میں انسانی رُوح کی تکمیل ہوتی ہے وہ اس زندگی کے ختم ہونے کو رُوح کی کشمکش کا خاتمہ قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے بعد بھی اس کشمکش کو جاری بتلاتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ اس زندگی میں انسان نسبتی طور پر اندھیرے میں کوشش کرتا ہے اور مرنے کے بعد نیک و بد دونوں کو ایک بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جسکی رہنمائی میں وہ آیندہ ترقی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ بدلوگ اپنے پیدا کردہ ماحول سے نجات پانے کے لئے اور نیک لوگ مزید ترقیات کے لئے۔ یہی وہ یقین ہے جس نے سچے مسلمانوں کو ہمیشہ موت سے نڈر بنائے رکھا ہے اور جب بھی اس ایمان کے ساتھ مسلمان اُٹھتے ہیں دُنیا پر غالب آتے ہیں۔ جو لوگ اس دُنیا کو اپنی ترقیات کا انجام سمجھتے ہیں کبھی نیکی کے لئے جدو جہد نہیں کر سکتے جو بعد الموت زندگی پر ایمان لانے والے کر سکتے ہیں اس دُنیا کو منتہا قرار دینے والے بار بار دنیاوی لذّات کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور جسمانی آرام کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

۵۴۸ حلِ لغات:۔ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۵۴۱ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اُذْكُرُوْا۔ اُذْكُرُوْا کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۵۴۱ اُذْكُرُوْا

نِعْمَتِيَ۔ نِعْمَةٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات نِعْمَتِيَ

نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ

کسی دوسرے شخص کا قائم مقام نہ بن سکے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی سفارش منظور کی جاوے گی اور

سورہ بقرہ ۴۸

۱ نعمتُ علیکم — اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ :۔ اَنْعَمْتُ اَنْعَمَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور انعام کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ۶

۲ فضّلتکم — فَضَّلْتُكُمْ : فَضَّلْتُ فَضَّلَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور فَضَّلَهٗ عَلٰى غَيْرِهٖ کے معنے ہیں جَعَلَ لَهٗ مَزِيَّةً عَلَيْهِ وَحَكَمَ لَهٗ بِالْفَضْلِ دوسرے کے مقابل پر اس کو خوبی کے اعتبار سے عمدہ قرار دیا۔ اور خوبیوں کی بنا پر اسے دوسروں سے افضل قرار دیا۔ نیز فَضَّلَهٗ کے معنے ہیں صَيَّرَهٗ اَفْضَلَ مِنْهُ اسے دوسروں کے مقابل ممتاز اور افضل قرار دیا (اقرب) پس فَضَّلْتُكُمْ کے معنے ہونگے یعنے تم کو فضیلت دی اور دوسروں سے ممتاز بنا دیا۔

۳ اِنّی فضّلتکم علی العٰلمین سے مراد سارے جہان کی قومیں نہیں

۳ العالمین — اَلْعٰلَمِيْنَ :۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ۲۔

۴ آیت ہذا میں بنی اسرائیل کو آخری کلام پر ایمان لانے کی طرف مزید توجہ کا مضمون لکھا گیا

تفسیر۔ اس آیت میں ایک اور ذریعہ سے بنی اسرائیل کو خدا تعالےٰ کے آخری کلام پر ایمان لانے کی طرف توجہ دلائی ہے پچھلے رکوع میں تو انہیں اس طرف متوجہ کیا تھا کہ خدا تعالیٰ سے تم نے ایک عہد کیا تھا خدا تعالےٰ نے اس عہد کے متعلق اپنی ذمہ داری پوری کردی لیکن تم نے اپنی ذمہ واری پوری نہیں کی اس لئے خدا تعالیٰ کے فضل سے محروم ہو گئے۔ اب پھر ایک نیا کلام تمہاری کتب کی دی ہوئی خبروں کے مطابق نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آؤ تو نئے سرے سے تم پر خدا تعالیٰ کے فضل نازل ہونے لگینگے اب اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ محسن کی محبت تو شریفوں کا خاصہ ہے خدا تعالیٰ کے تم پر بیحد احسان ہیں تمہاری قوم کو ادنیٰ حالت سے اُٹھا کر اس نے ایسی ترقی دی کہ دُنیا کی بہترین قوموں میں سے بنا دیا پھر کیوں اس کے احسان کی قدر نہیں کرتے اور اس کے پیغام کو رد کرتے ہو۔ احسان کی قدر کرو اور اپنے محسن سے مُنہ نہ موڑو۔

اَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ سے یہ مراد نہیں کہ اگلی پچھلی سب قوموں پر فضیلت دی۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی۔ قرآن شریف میں اُمتِ محمدیہ کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ تمام امتوں سے بڑھ کر ہے جیسا کہ فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران ع ۱۲) اور فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (بقرہ ع ۱۷) یہ امر کہ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ سے مراد اسی زمانہ کے لوگ ہیں قرآن شریف کی اس آیت سے خوب کھل جاتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران ع ۴) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عَالَمِيْنَ سے مراد اپنے اپنے زمانہ کے لوگ ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے جن انبیاء اور لوگوں کا ذکر ہے وہ مختلف زمانوں میں گزرے ہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں سے ہر ایک تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر آدمؑ تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت رکھتے تھے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ نوحؑ پر اور دوسرے بزرگوں پر بھی جن کا اس آیت کریمہ میں ذکر ہے ان کو فضیلت حاصل تھی اس صورت میں ان دوسرے بزرگوں کی نسبت کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان کو تمام زمانوں کے لوگوں پر فضیلت دی تھی پس بلاشبہ عَالَمِيْنَ سے مراد خاص زمانہ کے لوگ ہیں ان آیات کے علاوہ ایک اور آیت بھی عَالَم کے معنوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ سورۃ حجر ع ۵ میں حضرت لوطؑ کے ذکر میں آتا ہے کہ جب وہ چند مہمانوں کو اپنے گھر لے آئے تو شہر والوں نے اُن سے کہا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ کیا ہم نے

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ

نہ اس سے (کسی قسم کا) معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جاوے گی ۵۴۹ اور (اس

تجھے غیر قوموں کے لوگوں کو شہر میں لانے سے منع نہیں کیا تھا اس جگہ عَالَمِیْن سے مراد اردگرد کے لوگ ہیں نہ کہ اگلی پچھلی نسلوں کے آدمی۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں جہاں عَالَمِیْن کا لفظ استعمال ہوا ہے ضروری نہیں کہ سپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہو بلکہ اس کے معنی اردگرد کے لوگ یا اسی زمانہ کے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی دونوں معنے آیت زیر تفسیر میں مُراد ہیں۔

اس آیت میں فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ فرمایا ہے اَلنَّاس نہیں فرمایا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی فضیلت کئی رنگ میں تھی۔ عَالَم کے معنے جیسا کہ نوٹ ۵۳ سورہ فاتحہ میں بتایا جا چکا ہے اس گروہ یا قسم کے ہیں جو خدا تعالیٰ کے ملئے بطور نشان ہوتا ہے پس عَالَمِیْن کا لفظ مختلف قسم کی خصوصیات رکھنے والے گروہوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہر قسم کے روحانی علوم میں تم کو ترقی ملی تھی۔ اگر اَلنَّاس ہوتا تو ایک قسم کی ترقی ہی اس سے سمجھی جا سکتی تھی۔ مگر عَالَمِیْنَ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ روحانیت کے سب میدانوں میں انہیں فضیلت بخشی گئی۔ کیا بلحاظ شریعت کے کیا بلحاظ روحانیت کے کیا بلحاظ اخلاق فاضلہ کے۔ غرض ہر قسم کے صاحب کمال لوگ ان میں پیدا ہوئے۔ جو اس زمانہ کے یا اردگرد کی قوموں کے دوسرے صاحب کمال لوگوں پر فضیلت رکھتے تھے۔

۵۴۹ حل لغات ۔ اِتَّقُوْا ۔ اِتَّقُوْا ۔ امر مخاطب کا جمع کا صیغہ ہے اِتَّقٰی کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۵۳

يَوْمًا ۔ یوم کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ فاتحہ ۵۰

لَا تَجْزِیْ ۔ جَزٰی سے مضارع منفی واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اَلْجَزَاءُ (جو جَزٰی کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلْمُكَافَاةُ عَلَى الشَّیْءِ کسی بات پر کسی کو کوئی بدلہ دینا اور جب کہیں کہ جَزَی الشَّیْءُ تو اس کے معنی ہونگے کَفٰی ایک چیز دوسری چیز کی ساری باتوں میں قائم مقام ہو گئی اور پہلی چیز سے استغناء حاصل ہو گیا (قاموس) نیز کہتے ہیں جَزَیْتُ فُلَانًا حَقَّهٗ اور مطلب یہ ہوتا ہے قَضَيْتُهٗ کہ میں نے اس کے حق کو پورا کر دیا (لسان) وَتَأْتِیْ جَزٰی بِمَعْنٰی اَغْنٰی اور جَزٰی کے معنے بعض اوقات اَغْنٰی کے ہوتے ہیں یعنی کوئی چیز دوسری چیز کے قائم مقام ہو گئی (لسان) پس لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ کے معنے ہونگے (١) کوئی نفس قائم مقام نہیں بن سکے گا (٢) کوئی شخص حقوق کو پورا نہیں کر سکے گا۔

نَفْسٌ ۔ نَفْسٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۴۵

شَفَاعَةٌ ۔ شَفَعَ کا مصدر ہے۔ شَفَعَ کا دوسرا مصدر اَلشَّفْعُ ہے اور اَلشَّفْعُ کے معنی ہیں ضَمُّ الشَّیْءِ اِلٰی مِثْلِهٖ ایک چیز کے ساتھ اس جیسی دوسری چیز ملا کر ان دونوں کو جمع کر دینا۔ اور اَلشَّفَاعَةُ کے معنے ہیں اَلْاِنْضِمَامُ اِلٰی اٰخَرَ نَاصِرًا لَهٗ وَ سَائِلًا عَنْهُ کسی شخص کا کسی شخص کے ساتھ اس کی مدد کرنے کی خاطر مل جانا اور اس سے حق کا مطالبہ کرنے والے سے التجا کرنا کہ قصوروار کے قصور کو معاف کر دے۔ وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِی اِنْضِمَامِ مَنْ هُوَ اَعْلٰی حُرْمَةً وَّ مَرْتَبَةً اِلٰی مَنْ هُوَ اَدْنٰی اور شفاعت کے لفظ کا اکثر استعمال ایسے دو اشخاص کے ملنے پر ہوتا ہے جن میں سے ایک عزت و رتبہ کے لحاظ سے اعلیٰ مقام رکھتا ہو اور دوسرا ادنے ۔ اور عزت و رتبہ رکھنے والا شخص ادنیٰ شخص سے اس کی مدد کی خاطر مل جائے (مفردات) اقرب الموارد میں ہے کہ جب شَفَعَ کا لفظ کسی عدد کے لئے یا نماز کے لئے استعمال کریں تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَيَّرَهٗ شَفْعًا اَیْ زَوْجًا اَیْ اَضَافَ اِلَی الْوَاحِدِ ثَانِيًا وَاِلَی الرَّكْعَةِ

حاشیہ (بر کنارہ):

١ عالم سے مراد اردگرد یا خاص زمانہ کے لوگ

٢ شَفَاعَةٌ

١ بنی اسرائیل کو عالمین پر فضیلت بخشے جانے سے مراد روحانیات کے سب میدانوں میں فضیلت بخشے جانا ہے۔

اِتَّقُوْا

يَوْمًا

لَا تَجْزِیْ

اُخْرٰی ایک عدد کے ساتھ دوسرا عدد ملا دیا اور ایک کو دو کر
دیا یا ایک رکعت کے ساتھ دوسری رکعت ملا کر ان کو دو رکعت بنا
دیا۔ چنانچہ جب یہ کہیں کہ کَانَ وِتْرًا فَشَفَعَہٗ بِآخَرَ تو
اس کے معنے ہوتے ہیں قَرَنَہٗ بِہٖ وہ اکیلا تھا اس کے
ساتھ ایک اور ساتھی ملا دیا اور اس کو جوڑا کر دیا اور جب شُفِعَ
لِیَ الْاَشْخَاصُ بصیغہ مجہول کہیں تو اس کے معنے ہوتے
ہیں اَرَی الشَّخْصَ شَخْصَیْنِ لِضُعْفِ بَصَرِیْ
بینائی کی کمزوری کی وجہ سے مجھے ایک شخص کی جگہ دو اشخاص نظر
آتے ہیں نیز جب شَفَعَ لَہٗ اَوْ فِیْہِ اِلٰی فُلَانٍ شَفَاعَۃً
کہیں تو اس کے معنی ہونگے طَلَبَ اَنْ یُّعَاوِنَہٗ اس سے
خواہش کی کہ وہ اس کی کسی معاملہ میں مدد کرے اور جب شَفَعَ
لِفُلَانٍ فِی الْمَطْلَبِ کا فقرہ بولیں تو اس وقت یہ مراد ہوگی
کہ سَعٰی اس نے کسی مقصد اور ارادہ کو پورا کرنے کے لئے
کوشش کی اور جب شَفَعَ لِیْ بِالْعَدَاوَۃِ کا فقرہ بولیں
تو معنے ہونگے اَعَانَ عَلَیَّ اس نے میرے خلاف مدد دی
(اقرب) اَلشَّفَاعَۃُ کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
اَلشَّفَاعَۃُ:۔ اَلسُّؤَالُ فِی التَّجَاوُزِ عَنِ الذُّنُوْبِ
مِنَ الَّذِیْ وَقَعَتِ الْجِنَایَۃُ فِیْ حَقِّہٖ کہ شفاعت
کے معنے ہیں کہ جس کے حق میں کسی سے قصور اور غلطیاں
سرزد ہوئی ہوں اس سے یہ خواہش اور سوال کرنا کہ وہ قصوروار
سے اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر کرے وَ
قِیْلَ لَا تُسْتَعْمَلُ اِلَّا بِضَمِّ النَّاجِیْ اِلٰی نَفْسِہٖ
مَنْ خَافَ مِنْ سَطْوَۃِ الْغَیْرِ کہ بعض کے نزدیک
شفاعت کا لفظ اسی وقت بولا جاتا ہے جب کوئی ایسا شخص
جو خود نجات یافتہ ہو کسی ایسے شخص کی تائید پر کھڑا ہو جائے
جو دوسرے کی سزا سے خائف ہو (اقرب)

عَدْلٌ

عَدْلٌ:۔ اَلْعَدْلُ ضِدُّ الْجَوْرِ۔ عدل کا لفظ جور
یعنی ظلم کے بالمقابل بولا جاتا ہے یعنی اس کے معنے انصاف
کے ہیں نیز اس کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ مثل اَلنَّظِیْرُ نظیر
اَلْجَزَاءُ بدلہ معاوضہ۔ اَلْفِدَاءُ فدیہ۔ اَلنَّافِلَۃُ عطیہ
یا فرض سے زائد بات (اقرب)

آیت واتقوا ... الخ میں بنی اسرائیل کے بعض غلط خیالات کا رد

تفسیر۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کے بعض ایسے
خیالات کو رد کیا گیا ہے جو ان کو بدیوں پر دلیر کرتے تھے
اور نیکیوں سے محروم کرتے تھے بنی اسرائیل کے مختلف گروہوں
کے غلط خیال اس بارہ میں یہ تھے (۱) ان کے گناہوں کا
بار کوئی دوسرا وجود اُٹھائے گا (۲) ان کے بزرگ ان کی
شفاعت کرکے انھیں بچا لیں گے (۳) ان کو بعض نیکیاں
حاصل ہیں جو ان کے گناہوں سے بہرحال زیادہ رہیں گی
اور گناہوں کا بدلہ دے کر بھی وہ جنت کے مستحق رہیں گے۔
اس آیت میں ان خیالات کا رد کیا گیا ہے تا بنی اسرائیل کو
نیکی کا اصل مفہوم معلوم ہو۔ اور وہ صداقتوں کا انکار کرکے
تباہ نہ ہو جائیں۔

انسانی فطرت میں اعلیٰ روحانی مقام کے حاصل کرنیکا احساس اور اسکا قرآن کریم میں ذکر

اس آیت کا مضمون سمجھنے کے لئے اس امر کو سمجھنا
ضروری ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ امر مرکوز ہے کہ وہ اعلیٰ
رُوحانی مقام کو حاصل کرے متمدن اقوام ہوں کہ غیر متمدن قبائل
سب میں یہ احساسِ کمال کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے افریقہ
کے حبشی ہوں یا مکسیکو کے قدیم باشندے یا آسٹریلیا کے
ابتدائی نسلوں کے آدمی سب اس خواہش سے متاثر نظر آتے
ہیں بعض میں یہ احساس معیّن صورت میں پایا جاتا ہے اور
بعض میں مبہم صورت میں مگر پایا سب میں جاتا ہے قرآن کریم
نے اس احساس کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے
فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى
اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ
شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا
عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ
اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ
اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ (اعراف
ع ۲۲) اور یاد کر جبکہ تیرے رب نے تمام انسانوں کی
پیٹھوں سے ان کی اولاد کو لیا اور انھیں اپنی جانوں پر گواہ

بنایا۔ اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں سب نے کہا کہ ہاں تُو ہمارا رب ہے۔ اے لوگو یہ ہم نے اس لئے کیا تا تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس امر سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہو کہ ہمارے باپ دادوں نے شرک کیا تھا اور ہم اُن کے بعد آنے والی نسل تھے۔ اس لئے لازماً ہم ان کے خیالات سے متاثر ہوئے پھر کیا تُو ہم کو اُن جھوٹ بولنے والوں کے جُرم کے بدلہ میں سزا دے گا۔ اس آیت میں نہایت لطیف استعارہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہر انسان اپنے آباء کی پیٹھوں سے ہی یعنی پیدائشی طور پر توحید کا اثر لے کر نکلتا ہے اور شرک کا رنگ بعد میں اس کے پیدا ہونے کے بعد اس کے ماں باپ اس پر چڑھاتے ہیں۔ اگر توحید کا اثر خدا تعالیٰ نے فطرت انسانی پر نہ ڈالا ہوتا تو انسان شرک کرنے میں معذور ہوتا لیکن اس نے توحید کا اقرار پیدائشی طور پر اس کے اندر رکھ کر ہر انسان پر حجت کر دی ہے اب نہ تو وہ ناواقفی کا عذر کر سکتا ہے اور نہ اپنے ماں باپ کے اثر کا عذر پیش کر سکتا ہے۔ اس فطری اثر کو ہم ہر قوم اور ہر قبیلہ میں محسوس کرتے ہیں ہمیشہ سے انسان اپنے پیدا کرنے والے خدا کا قُرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا آیا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ لگن فطرت میں پائی جاتی ہے اور کہیں باہر سے نہیں آئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم دیکھتے ہیں کہ انسان سستی غفلت یا سہل انگاری کی وجہ سے اس مقصد کو پانے کے لئے سہل راستے تلاش کرتا رہتا ہے فلسفیانہ رنگ کے لوگ اس خواہش کو اس طرح پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو چونکہ اس دنیا کے ماحول میں پیدا کیا ہے۔ اس لئے وہ ہم سے صرف اس قدر امید کرتا ہے کہ ہم اچھے شہری ہو کر رہیں۔ اگر ہم اس مقصد کو پورا کر دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس قدر ذمہ واریاں ہیں سب ادا ہو جاتی ہیں۔ تو فلسفی نیس و مختلف قسم کی عارضی قربانیوں سے قَالُوْا بَلٰی کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں یہ قربانیاں بعض وقت ظاہر میں بڑی نظر آتی ہیں لیکن حقیقتاً اصل قربانی کا چھوٹا قائم مقام ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض لوگ بجائے مستقل نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے اور رات اور دن اپنے نفس کی اصلاح اور اپنی خواہشات کی قربانی کا کٹھن راستہ طے کرنے کے اپنے بعض اعضاء کاٹ دیتے ہیں اور اسے اس دائمی اور پوری قربانی کا قائم مقام سمجھ لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ذمہ حقیقی پاکیزگی کے حصول کے لئے مقرر کی ہے بعض لوگ شہوانی جذبات کو دبانے کی طاقت نہ پا کر اس عضو کو جو اس کا ذریعہ ہے کاٹ دیتے ہیں بعض لوگ غیبت جھوٹ اور بدکلامی سے رُکنے کی ہمت نہ دیکھ کر اپنی زبان کٹوا دیتے ہیں بعض دُنیا میں رہتے ہوئے خدا تعالیٰ کے ذکر کی طاقت نہ پا کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں اور کبھی ننگے رہ کر اپنے خیال میں آسائش کی قربانی کرتے ہیں اور کبھی سر کے بل لٹک کر اپنی ذمہ واری کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں (جیسا کہ ہندوؤں میں دیکھا جاتا ہے) لیکن یہ سب طریقے اپنے اصل فرائض سے بھاگنے کے مترادف ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی تکمیل کو ان چیزوں پر منحصر رکھتا تو اسے ایک متمدن انسان پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تبتّل یعنی نکاح سے بچنا نیکی کا اصل ذریعہ ہے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ دنیا کے کامل کرنے کا ذریعہ اسے فنا کرنا ہے جو کہ بالبداہت باطل ہے۔ اگر تبتّل ہی انسانی زندگی کا کمال ہے تو سب انسانوں کو کامل ہونا چاہیئے اور اگر سب انسان ہی تبتّل اختیار کر لیں تو ایک نسل میں ساری دنیا ختم ہو جاتی ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ تبتّل کمال کا ذریعہ نہیں بلکہ کامل لوگ تبتّل سے کام لیتے ہیں لیکن یہ خیال بھی بالبداہت باطل ہے کیونکہ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ کاملوں کی نسل اس دُنیا میں نہ چلے اور ناقصوں کی چلے۔ حالانکہ جانوروں میں اچھے گھوڑے اچھے بیل اور اچھے بھینسے اور اچھے اونٹ اور اچھے بکرے سے نسل لی جاتی ہے کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے اچھی نسل چلتی ہے۔ یہی طریق پھل دینے والے درختوں اور پھول لانے والے پودوں میں اختیار کیا جاتا ہے اور یہی طریق اناج اور سبزی ترکاری پیدا کرنے میں اختیار کیا جاتا ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ اچھا اناج اچھے بیج سے اور اچھا پھل اچھے درخت کے پیوند سے اور اچھا جانور اچھے سانڈ سے پیدا ہو

ے
اس خیال کا بطلان کہ کامل لوگ تبتّل سے کام لیتے ہیں

ت
ہر انسان توحید کا اثر فطرتاً لیکر پیدا ہوتا ہے شرک کا رنگ اس کے ماں باپ اس پر چڑھاتے ہیں۔

ث
فلسفیوں کی طرف سے عارضی قربانیوں کے ذریعہ سے قالوا بلیٰ کا جواب دینے کی کوشش

لیکن انسانوں میں سے اچھے لوگوں کو تو بے نسل رکھا جائے اور ناقص انسانوں سے نسل لی جائے۔ یہ ایسا غلط خیال ہے کہ کوئی معقول انسان اسے مان نہیں سکتا۔ بعض قوموں میں خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنے اور اس کے غضب سے بچنے کے لئے اولاد کی قربانی دی جاتی تھی قریباً دنیا کے ہر ملک میں اسکی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس رسم کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رؤیا میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کرنے کا حکم دیا تاکہ ان کا ایمان دُنیا پر ظاہر ہو جائے اور اس رسم کو بھی ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے بعض قوموں میں مجرموں یا اجنبیوں کو پکڑ کر قربانی میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہ سب غیر طبعی غیر حقیقی اور غیر معقول خیالات تھے جو ایک طرف خدا تعالیٰ کی صفات اور دوسری طرف انسانی فطرت کی پاکیزگی کی حقیقت نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتے رہے۔ اگر یہ لوگ غور سے کام لیتے تو سمجھ جاتے کہ یہ طریق تکمیل کا نہیں ہے تکمیل کا طریق دائمی طور پر بُرے جذبات سے جوکس رہنا اور ان سے بچنے کے لئے اپنے نفس سے برسرِ پیکار رہنا اور اس کے ساتھ متواتر اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت رکھنا اور اسکی مدد حاصل کرتے رہنا ہے۔

جہاں مذہب کے متعلق تفصیلی تعلیم نہ رکھنے والے گروہوں میں اوپر کے غلط خیال پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنی ضمیر کو تسلی دینے کے لئے اور تکمیل انسانی کی حقیقی جنگ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ان تین طریقوں کو ایجاد کر رکھا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ جن قوموں میں کوئی مکمل شریعت نہیں ان میں یہ خیالات نہیں پائے جاتے ان میں بھی ان خیالات کے پردے میں اپنے نفس کے خواطر کو چھپایا جاتا ہے مگر تفصیلی مذاہب کے پیرووٗں میں ان امور کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور دوسرے امور کو کم۔ اس آیت میں اصل مخاطب بنی اسرائیل ہیں اور وہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اس وقت دو حصوں میں تقسیم تھے (۱) یہود (۲) نصاریٰ۔ ان دونوں قوموں میں حقیقی نیکی کے مٹ جانے پر تنزل کے زمانہ میں یہ خیالات زور پکڑ گئے تھے وہ ہر وقت چوکس رہ کر اور رات دن اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار رہ کر اس کو پانے کی بجائے یہ سمجھنے لگ گئے تھے کہ اگر وہ شریعت اور آسمانی طریق کو نظرانداز بھی کر دیں تو کوئی حرج نہیں۔ انہیں یا تو بزرگوں کے کفارہ کے ذریعے نجات حاصل ہو جائے گی یا بزرگوں کی شفاعت سے۔ یا پھر ان نسلی تعلقات سے جو انہیں حاصل ہیں اور یا ان مالی قربانیوں کی وجہ سے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں۔

یہودیوں اور نصاریٰ کے کفارہ کا غلط عقیدہ اور اس کا ردّ آیت لا تجزی نفس عن نفس سے

اب میں الگ الگ ان تینوں امور کے متعلق یہودی اور نصرانی تعلیم کو بیان کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ کس طرح یہ اقوام غلطی میں پڑ کر نجات کے حقیقی راستے سے دُور جا پڑی ہیں۔

پہلا باطل خیال جو یہود و نصاریٰ میں پیدا ہو گیا تھا اور اب تک موجود ہے اور جس کی تردید اس آیت میں قرآن کریم نے کی ہے یہ ہے کہ کوئی اور وجود ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا اور وہ اپنے گناہوں کی سزا سے بچ جائیں گے۔ یہود میں یہ خیال ابتداءً قربانی سے پیدا ہوا یعنے جب تقویٰ کی حالت ان میں کمزور پڑ گئی۔ تو انہوں نے ان قربانیوں سے جن کا ان کے مذہب میں توبہ کی طرف توجہ دلانے کے لئے حکم تھا یہ تسلی حاصل کرنا شروع کر دی کہ یہ قربانیاں ان کے گناہوں کا حقیقی کفارہ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں "اور ہارون اپنے دونوں ہاتھ اس جیتے حلوان کے سر پر رکھے۔ اور بنی اسرائیل کی ساری بدکاریوں اور ان کے سارے گناہوں اور خطاؤں کا اقرار کر کے۔ ان کو اس حلوان کے سر پر دھرے۔ اور اسے کسی شخص کے ہاتھ۔ جو اس کے لئے معین ہو۔ بیابان کو بھجوا دے کہ وہ حلوان ان کی ساری بدکاریاں اپنے اوپر اُٹھا کے ویرانے میں لے جائے گا اور وہ اس حلوان کو بیابان میں چھوڑ دے" (احبار باب ۱۶ آیت ۲۱-۲۲) نیز فرماتے ہیں "اور خطا کی قربانی کی بابت ایک بکرا۔ تاکہ اس سے تمہارے لئے کفارہ دیا جاوے" (گنتی باب ۲۸ آیت ۲۲) یعنی جہاں اور قربانیاں پیش کیا کرو وہاں اپنی خطاؤں کے کفارہ کے طور پر ایک بکرا بھی قربانی کیا کرو تا وہ بکرا تمہارے لئے کفارہ ہو جائے

اور تمہارے گناہوں کو اپنی قربانی سے مٹا دے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہیں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے احکام کو دیکھتے ہوئے ان کے یہ معنے کرنے کہ بکرے یا بیل کی قربانی انسانی گناہوں کا حقیقی کفارہ ہے بالکل درست نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دوسری جگہ فرماتے ہیں "یہ وہ شریعتیں اور حقوق اور احکام ہیں جو خداوند تمہارے خدا نے مجھے فرمائے۔ کہ میں تمہیں سکھلاؤں تاکہ تم اس سرزمین میں جس کے وارث ہوتے جاتے ہو۔ ان پر عمل کرو۔ تاکہ تو خداوند اپنے خدا سے ڈرتا رہے اور اس کے سب حقوق اور اس کے سب حکموں کو جو میں تمہیں فرماتا ہوں حفظ کرے نہ فقط تُو بلکہ تُو اور تیرا بیٹا اور تیرا پوتا۔ زندگی بھر۔ تاکہ تیری عمر کے دن بڑھائے جاویں" (استثناء باب ۶ آیت ۱-۲) پھر لکھا ہے "سُن لے اے اسرائیل۔ خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ اور یہ باتیں جو آج کے دن میں تجھے فرماتا ہوں تیرے دل میں رہیں اور تُو یہ باتیں کوشش سے اپنے لڑکوں کو سکھلا۔ اور تُو اپنے گھر میں بیٹھتے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اُٹھتے وقت ان کا چرچا کر اور تُو ان کو نشانی کے لئے اپنے ہاتھ پر باندھ۔ اور وے تیری آنکھوں کے درمیان ٹیکوں کی مانند ہوں گے انہیں اپنے گھر کی چوکھٹوں اور پھاٹکوں پر لکھ" (باب ۶۔ آیت ۴ تا ۹) پھر لکھا ہے "اور تم وہی کرو جو خداوند کی نظر میں راست اور درست ہے۔ تاکہ تمہارا بھلا ہو۔" (باب ۶ آیت ۱۸) اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دل کی درستی اور نیکی اور توحید اور شریعت پر انتہا درجہ کا زور دیتے ہیں اور ان پر عمل کو ایسا ضروری قرار دیتے ہیں کہ انہیں تحریر و تقریر سے پھیلانے اور ایک دوسرے کی تلقین کرنے بلکہ در و دیوار پر لکھ رکھنے تک کی تاکید کرتے ہیں۔ اس تعلیم کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک قوم کی قوم کے گناہ ایک بکرے کی قربانی سے دُھل جائیں گے اگر گناہوں کا دُھلنا اتنا ہی آسان ہے تو پھر اس قدر زور شریعت پر دینے بلکہ حق یہ ہے کہ شریعت نازل کرنے ہی کی ضرورت کیا ہو سکتی تھی۔

قرآن کریم کا یہود کو کفارہ کا عقیدہ رکھنے پر انتباہ۔

قرآن کریم یہود کے اس غلط خیال کی تردید فرماتا ہے اور یہود کو ہوشیار کرتا ہے اور اس دن سے ڈراتا ہے جبکہ وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اور کوئی جان (قربانی کیا ہوا بکرا) کسی جان (یہودی) کی جگہ اس کے حضور میں قبول نہ کی جائے گی بلکہ اس دن اپنے نفس کی پاکیزگی ہی کام آ سکے گی۔

جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم جو خطا کی قربانی کے بارہ میں ہے۔ اس کے معنی صرف یہ تھے کہ بکرے کی قربانی سے نفس کی قربانی کی طرف توجہ دلائی جائے اور بکرے کی قربانی صرف ایک تصویری زبان میں نصیحت تھی۔ مگر یہود نے سہل انگاری سے کام لیکر اصل نصیحت کو نظر انداز کر دیا اور تمثیل کو اصل قرار دیکر نفس کی پاکیزگی کو پیچھے ڈال دیا۔ اور بکرے کی قربانی کو اپنے لئے کافی سمجھا۔

بنی اسرائیل پر کفارہ کے عقیدہ کا اثر

اس قسم کے کفارہ کا اثر بنی اسرائیل کی طبیعت پر ایسا گہرا تھا کہ جب بخت نصر بادشاہِ بابل نے بیت المقدس کو مسمار کر دیا تو چونکہ قربانیاں اسی جگہ ہوتی تھیں ان کو یوں معلوم ہوا کہ گویا آئندہ گناہ بخشوانے کا کوئی ذریعہ ہی ان کے پاس نہیں رہا اور بہت سے آدمی اس صدمہ کی وجہ سے تارک الدنیا ہو گئے (جوئش انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل ص۲۷۵ کالم اوّل بحوالہ توسفتا باب ۱۵۔ آیت ۲)، اور ایک بڑے عالم جوشا بن حنانیہ نے واویلا کر کے کہا "ہم پر افسوس اب ہمارے گناہوں کا کفارہ کس طرح ہو گا (جوئش انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل کالم اوّل بحوالہ اسدرا باب ۹ آیت ۳۶)

میں بتا چکا ہوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ بکرے کی قربانی گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی بلکہ ان کا منشا صرف یہ تھا کہ بکرے کی قربانی سے نفس کی قربانی کی طرف توجہ دلائی جائے چونکہ ان کے زمانہ میں لوگ رسوم اور تصویری زبان کے شیدا تھے اللہ تعالیٰ نے نفس کی قربانی کا مضمون ان کے سامنے رکھنے کے لئے بکرے کی قربانی کی ایک رسم ان میں رکھ دی تاکہ سب قوم کی ایک مقررہ دن گناہوں کے ازالہ کی طرف توجہ ہو جائے

مگر انہوں نے تصویری زبان کو تو بھلا دیا۔ مگر تصویر کو قائم رکھا بیت المقدس کے گرائے جانے پر جو صدمہ یہود کو ہوا۔ اسکی وجہ سے انبیائے وقت نے انکے اس غلط خیال کی تردید شروع کر دی کہ انسان کے گناہ کوئی بیل یا بکرا اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ہوسیع نبی فرماتے ہیں "تم کلمہ ساتھ لے کے خدا کی پھرو۔ اور اسے کہو کہ ساری بدکاری کو دُور کر اور ہمیں عنایت سے قبول کر۔ تب ہم ہونٹوں کے بچھڑے نذر گزرانیں گے (ہوسیع باب ۱۴ آیت ۲)

مختلف انبیاء کی طرف سے یہودیوں کے خیالی کفارہ کے باطل ہونے کا اعلان۔

اس آیت میں ہوسیع نبی یہود کو بتاتے ہیں کہ عام بچھڑا یا بکرا کفارہ نہیں بنتا۔ بلکہ توبہ اور تسبیح اور تحمید سے انسان گناہ کے اثر سے نجات پاتا ہے۔ گائے کے پیٹ سے نکلا ہوا بچھڑا نہیں بلکہ تائب کی زبان سے نکلا ہوا بچھڑا حقیقی کفارہ ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے عاموس نبی نے یہود کو ان قربانیوں پر بھروسہ کرنے سے اس طرح ہوشیار کیا۔ "اور تم ہرچند سوختنی قربانیوں اور ہدیوں کو میرے آگے گزرانو گے۔ تو بھی میں انہیں قبول نہ کرونگا اور تمہارے موٹے بیلوں کے شکرانے کے ہدیوں کی طرف متوجہ نہ ہوں گا" (باب ۵ آیت ۲۲) پھر لکھا ہے کہ اصل علاج توبہ کا یہ ہے کہ "تو ایسا کر کہ عدالت پانی کی طرح بہتی رہے اور راستی بڑی نہر کی مانند" (آیت ۲۴)

یہودیوں کی کفارہ کے متعلق ایک اور ایجاد۔

یسعیاہ نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے فرماتے ہیں "اب آگے کو جھوٹے ہدیے مت لاؤ لبان سے مجھے نفرت ہے۔ نئے چاند اور سبت اور عیدی جماعت سے بھی کہ میں عید اور بدی دونوں کی برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔ میرا جی تمہارے نئے چاندوں اور تمہاری عیدوں سے بیزار ہے وہ مجھ پر ایک بوجھ ہیں۔ میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا" (باب ۱ آیت ۱۳ و ۱۴) پھر لکھا ہے "اپنے تئیں دھوؤ آپ کو پاک کرو اور اپنے بُرے کاموں کو میری آنکھوں کے سامنے سے دُور کرو۔ بدفعلی سے باز آؤ نیکوکاری سیکھو۔ انصاف کے پیرو ہو۔ مظلوموں کی مدد کرو یتیموں کی فریاد رسی کرو عورتوں کے حامی ہو اب آؤ کہ ہم باہم حجت کریں۔ خداوند کہتا ہے اگرچہ تمہارے گناہ قرمزی ہوویں۔ پر برف کی مانند سفید ہو جائیں گے اور ہرچند وے ارغوانی ہوویں پراُون کی مانند اُجلے ہونگے" (باب ۱ آیت ۱۶ تا ۱۸) اسی بارہ میں میکہ نبی فرماتے ہیں "میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں آؤں اور خدا تعالیٰ کے آگے کیونکر سجدہ کروں کیا سوختنی قربانیوں اور یک سالہ بچھڑے کو لیکر اس کے آگے آؤں گا۔ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا۔ کیا میں اپنے پلوٹھے کو اپنے گناہ کے عوض اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی جان کی خطا کے بدلے میں دے ڈالوں گا۔ اے انسان اس نے تجھے وہ دکھایا ہے جو کچھ کہ بھلا ہے اور خداوند تجھ سے اور کیا چاہتا ہے مگر یہ کہ تُو انصاف کرے اور رحم دلی کو پیدا کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے" (باب ۶ آیت ۶ تا ۸)

اُوپر کے حوالوں سے ثابت ہے کہ یہود کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر چکا تھا کہ قربانیاں ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں اور مختلف نبیوں نے انہیں اس عقیدہ سے ہٹانے کی کوشش کی اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ بکروں بیلوں بلکہ پلوٹھے لڑکوں کی قربانی تک سے خوش نہیں ہو سکتا۔ سابقہ گناہوں کے بد اثر سے بچنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ انسان دل سے اور زبان سے توبہ کرے اور راستبازی اور نیکوکاری کو اپنے عمل سے پھر قائم کرے۔ تب اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ مگر نبیوں کی یہ تعلیم دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ بکروں اور بیلوں کی قربانی کی عظمت تو یہود کے دلوں سے کچھ کم ہوئی۔ مگر ایک اور قسم کا کفارہ انہوں نے ایجاد کر لیا اور وہ یہ کہ ہمارے بزرگوں کی تکالیف ہماری قوم کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں اور اگر نیکوکار کسی زمانہ میں موجود نہ ہوں تو بے گناہ بچوں کو اللہ تعالیٰ مار کر قوم کے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے چنانچہ یہود کی کتب میں لکھا ہے "جس نسل میں نیک لوگ نہ ہوں بے گناہ سکول کے بچوں کو خدا تعالیٰ لے جاتا ہے" (جوئش انسائیکلوپیڈیا جلد اوّل صفحہ ۲۸۰ کالم اوّل بحوالہ شبات طالمود) یہی خیال تھا جس نے بعد میں مسیحی کفارہ کے عقیدہ کے بننے میں مدد دی۔ قرآن کریم ان یہود کو مخاطب کر کے اس آیت میں فرماتا ہے کہ اے یہود بنی اسرائیل کوئی جان (خواہ بکرا ہو خواہ بزرگ خواہ بے گناہ

سکول کا بچہ) کسی اور جان (یہودی) کی قائم مقام نہیں ہو سکتی اور قرآن کریم کی اس تعلیم سے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے خود بنی اسرائیل کے نبیوں کو اتفاق ہے۔

بنی اسرائیل کا دوسرا حصہ وہ ہے جو مسیحی ہو چکا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح نے صلیب پر موت پا کر مسیحیوں کے گناہوں کو اٹھا لیا۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ قربانی جس کا حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا تھا مسیح کی آمد کی خبر تھی۔ اور اس سے اس خیال کو تازہ رکھا گیا تھا۔ کہ خدا کا ایک برہ یعنی مسیح دنیا میں آکر قربان ہو گا۔ اور دنیا کے گناہ اٹھالے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک برا میں یہ طاقت نہیں کہ وہ سب دنیا کے گناہ اٹھالے لیکن خدا کے بیٹے میں یہ طاقت ہے کہ وہ دوسروں کے گناہ اٹھالے۔ وہ یہود کے اس خیال کو کہ ہمارے بزرگوں نے تکالیف اٹھا کر ہمارے گناہوں کا کفارہ کر دیا اس دلیل سے رد کرتے ہیں کہ وہ بزرگ بہر حال گنہگار تھے۔ اور گنہگار گنہگار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پس مسیح جو بےگناہ تھا اس میں یہ طاقت تھی کہ وہ دوسروں کے گناہ اٹھائے۔ مسیح بغیر کسی گناہ کے صلیب پر لٹکایا گیا۔ اور اسکی وجہ یہی تھی کہ وہ دوسروں کے گناہوں کی وجہ سے صلیب پر لٹکا اس طرح مسیح کے کفارہ کی نسبت وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ گناہ انسان کو آدم کے گناہ کے نتیجہ میں ورثہ میں ملا۔ مسیح چونکہ بلا باپ تھے اس لئے وہ آدم کے گناہ کے وارث نہ تھے پس وہی اس قابل تھے کہ بےگناہ ہوتے اور چونکہ وہ بےگناہ تھے اس لئے وہی انسانوں کے گناہ کا کفارہ ہو سکتے تھے بعض مسلمانوں نے ان کے اس خیال کی نادانی سے اس طرح تائید کر دی کہ وہ کہتے ہیں سوائے مسیح اور ان کی ماں کے کوئی مس شیطان سے پاک نہیں گویا وہ اس خیال کی وجہ سے مسیحیوں سے بھی ایک ہاتھ آگے چلے گئے۔ اور جبکہ مسیحی صرف مسیح کو کلی طور پر بےگناہ کہتے ہیں وہ انکی ماں کو بھی مس شیطان سے اس طرح پاک قرار دیتے ہیں جس طرح اور کوئی نبی مس شیطان سے پاک نہیں ہوا (نعوذ باللہ من ذالک)

مسیح کے بےگناہ ہونے اور صلیب پر چڑھ کر لوگوں کے گناہ اٹھا لینے کے متعلق حضرت مسیح کا ایک قول بھی نقل نہیں کیا جاتا اور نہ نقل کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سراسر اس کے خلاف ہے (اگر ایسا حوالہ ہوتا بھی تو وہ قابل اعتبار نہ تھا کیونکہ موجودہ اناجیل سخت محرف مبدل ہیں) ہاں حواریوں کے بعض اقوال اس بارہ میں نقل کئے جاتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں "جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے مسیح ہمارے گناہوں کے واسطے مرا۔" (۱ قرنتھیوں باب ۱۵ آیت ۳) اس نے (یعنے مسیح نے) موت کی اذیت کے سبب جلال و عزت کا تاج پایا۔ تاکہ وہ خدا کے فضل سے سب آدمیوں کے لئے موت کا مزہ چکھے۔" (عبرانیوں باب ۲ آیت ۹ و ۱۰)" تاکہ وہ (یعنی مسیح) ان باتوں میں جو خدا سے نسبت رکھتیں لوگوں کے گناہوں کا کفارہ کرنے کے واسطے ایک رحیم اور دیانتدار سردار کاہن ٹھہرے۔" (عبرانیوں باب ۲ آیت ۱۷) "مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کہ وہ ہمارے بدلہ میں لعنت ہوا۔ کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے۔ (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) ان حوالوں اور بعض ایسے ہی اور حوالوں سے مسیحی نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسیح بےگناہ تھا۔ مگر وہ ایسی موت مرا جو لعنتیوں کی موت ہے کیونکہ وہ کاٹھ پر لٹکایا گیا جو تورات کی رو سے لعنتیوں کی موت ہے پس معلوم ہوا کہ اسکی موت اس کے لئے نہ تھی بلکہ دوسرے گنہگاروں کے لئے تھی تاکہ وہ ان کے لئے کفارہ ہو جائے۔

مسیح کے بے گناہ اور مصلوب ہونے کے متعلق عیسائیوں کے پیش کردہ حوالہ جات کی حقیقت۔

کفارہ کے متعلق مسیحی عقیدہ

یہ خیال جیسا کہ اوپر یہود کے عقائد کے بارہ میں لکھا جا چکا ہے یہود کے اس خیال کا نتیجہ ہے جو ان میں آخری زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے کہ بزرگ لوگ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس کا سبب قوم کو گناہوں کی سزا سے بچانا ہوتا ہے مگر یہ خیالات بائبل کی دوسری آیات کے بالکل خلاف ہیں مسیح علیہ السلام خود فرماتے ہیں "اور جو کوئی اپنی صلیب اٹھا کے میرے پیچھے نہیں آتا میرے لائق نہیں۔" (متی باب ۱۰ آیت ۳۸) یہی بات بہ تغییرِ الفاظ دوسری اناجیل میں بھی ہے۔ اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنی صلیب سے لوگوں کی نجات وابستہ نہیں بتاتے بلکہ ہر ایک شخص کا خود صلیب

پر لٹکنا اس کی نجات کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بھی جو موسوی سلسلہ کے بانی تھے اور جن کی تعلیم کو قائم کرنے کا دعویٰ حضرت مسیح کرتے ہیں اس قسم کے کفارہ کی تردید پائی جاتی ہے تورات میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ پر چالیس راتوں کے لئے گئے اور ان کے پیچھے بنی اسرائیل نے بچھڑا بنا لیا تو اللہ تعالےٰ کا غضب بنی اسرائیل پر بھڑکا اور اس نے ان کے تباہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لکھا ہے "پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے۔ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کروں۔ اور میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔" (خروج باب ۳۲ آیت ۹ و ۱۰) اس کے بعد لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف آئے اور شرک پر ناراضگی ظاہر کی۔ اور پھر لکھا ہے "اور دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا اور اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں کہ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کروں چنانچہ موسیٰ خداوند کے پاس پھر گیا اور کہا کہ ہائے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا معبود بنایا اور اب کاش کہ تو ان کا گناہ معاف کرتا۔ مگر نہیں تو میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے اپنے دفتر سے جو تو نے لکھا ہے میٹ دے" (خروج باب ۳۲ آیت ۳۰ تا ۳۲) ان آیات سے ظاہر ہے کہ اپنی قوم کو حضرت موسیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ دینے کا وعدہ کر کے پہاڑ پر گئے اور انہوں نے خدا تعالےٰ سے عرض کی کہ یا تو ان کا گناہ یوں ہی معاف کر دے نہیں تو مجھے تباہ کر کے ان کے گناہوں کا کفارہ کر دے۔ اس التجا کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب نہیں دیا کہ تو تو گنہ گار ہے۔ گنہ گار گنہ گار کا کفارہ کس طرح ہو سکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ جواب دیا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کو اپنے دفتر سے میٹ دوں گا۔" (آیت ۳۳) اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی گنہ گار کے بدلہ میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا قانون یہی ہے کہ وہ گنہ گار ہی کو سزا

انجیل اور تورات میں کفارہ کا رد

مسیحیت کے کفارہ کے متعلق دلائل اور ان کا رد قرآن مجید میں

دیتا ہے۔ اس تعلیم کی موجودگی میں یہ کہنا کہ مسیح اپنی قوم کے گناہوں کے لئے صلیب پر لٹکائے گئے۔ بائبل کی تعلیم کے خلاف ہے شاید کوئی کہے کہ یہ تعلیم حضرت مسیح کے وقت میں منسوخ ہو گئی مگر یہ تو ایک ازلی صداقت ہے اور ازلی صداقتیں منسوخ نہیں ہوا کرتیں۔ انسانوں کے متعلق احکام بدل سکتے ہیں خدا تعالیٰ کی سنتیں نہیں بدل سکتیں۔

جن دلائل پر مسیحیت کفارہ کی بنیاد رکھتی ہے وہ بھی عقلاً اور نقلاً غلط ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا ہے اس لئے وہ اس پر غالب نہیں آسکتا۔ گویا انسان کی فطرت ہی گنہ گار ہے۔ قرآن کریم اس کو رد فرماتا ہے اور فرماتا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین ع) ہم نے یقیناً انسان کو ہر قسم کی کجی سے پاک قوتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ (بخاری جلد اول کتاب الجنائز) ہر بچہ کامل فرمانبرداری کی روح لے کر پیدا ہوتا ہے عجیب بات ہے کہ مسیحی ایک طرف تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ورثہ کے گناہ پر انسان غالب نہیں آسکتا۔ اور اس لئے کفارہ کے لئے ایک ایسے وجود کی ضرورت تھی کہ جو بلا باپ پیدا ہوا ہو لیکن دوسری طرف وہ اس امر کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دو ہی انسان جن کو ورثہ کا گناہ نہ ملا تھا یعنی آدم و حوا وہ دونوں گنہ گار تھے۔ اگر وہ دونوں انسان جنہوں نے ورثہ میں گناہ نہ پایا تھا گنہ گار تھے تو پھر یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جن کو ورثہ میں گناہ نہ ملے وہ پاک رہ سکتے ہیں۔ یہ امر تو تب ثابت ہوتا اگر کئی مثالیں ایسی بھی پائی جاتیں کہ ورثہ میں گناہ نہ پا کر لوگ بے گناہ رہ گئے ہوتے مگر مسیحیوں کے نزدیک تو دو ہی ایسے وجود تھے اور دونوں ہی گنہ گار تھے۔ تیسرا وجود حضرت مسیح کا ان کے نزدیک ہے۔ لیکن حضرت مسیح کی نسبت یہ کہنا کہ بوجہ بے باپ ہونے کے ان کو ورثہ میں گناہ نہ ملا تھا محض ایک تحکم کا فیصلہ ہے کیونکہ بچہ صرف اپنے باپ کی قوتوں کو ورثہ میں نہیں لیتا بلکہ ماں کی قوتوں کو بھی ورثہ میں لیتا ہے نہ معلوم

کس نادان نے اس مسئلہ کی ایجاد کرنے والے کے دل میں یہ شبہ ڈال دیا کہ بچہ صرف باپ کی خصلتیں لیتا ہے بچہ جس طرح باپ کی خصلتیں لیتا ہے اسی طرح ماں کی خصلتیں لیتا ہے بعض دفعہ بچے باپ کی شکل پر ہوتا ہے بعض دفعہ ماں کی شکل پر بعض دفعہ باپ کی قوتوں کا حصہ اس میں زیادہ ہوتا ہے بعض دفعہ ماں کی قوتوں کا۔ اور بعض دفعہ برابر۔ برابر۔ پس اگر مسیح کا باپ نہ تھا تو اس سے یہ کیونکر نتیجہ نکلا کہ ان میں ورثہ کا گناہ نہ آیا تھا۔ وہ حضرت مریمؑ کے پیٹ میں پلے اور ماں کی خصوصیات کے وارث ہوئے اور عورت مسیحیوں کے نزدیک اسی طرح گنہ گار ہے جس طرح مرد۔ بلکہ بائبل کی رُو سے شیطان نے چونکہ حوا کے ذریعہ سے آدمؑ کو ورغلایا تھا۔ (پیدائش باب ۳ آیت ۱تا۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان عورت کو مرد کی نسبت گناہ کے زیادہ قریب سمجھتا تھا تبھی اس نے براہ راست آدمؑ کو ورغلانے کی کوشش کی۔ پس جو بچہ بائبل کے بیان کے مطابق صرف حوا کی کمزوری لے کر پیدا ہوا وہ گناہ کے زیادہ قریب تھا بہ نسبت اُن بچوں کے جو آدمؑ کی نسبتی طاقت سے حصہ لیتے ہیں خود مسیح علیہ السلام کی اپنی رائے اپنے بارے میں انجیل کے مطابق یہ ہے لکھا ہے کہ ایک شخص مسیحؑ کے پاس آیا اور اُن سے کہا۔ "اے نیک اُستاد میں کونسا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں اس نے اس سے کہا تُو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک یعنی خدا۔" (متی باب ۱۹۔ آیت ۱۶ و ۱۷) ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو نیک نہیں قرار دیتے۔ پھر انہیں ایک ہی نیک قرار دے کر کفارہ کی بنیاد اس پر رکھنی کہاں تک درست فعل ہو سکتا ہے۔ اس جگہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد مسیح موعود علیہ السلام نے جب اس آیت کو پیش کر کے مسیحیوں کے کفارہ کے عقیدہ پر اعتراض کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جو آیت اُنیس ۱۹ سو سال تک بقول مسیحیوں کے اناجیل کا حصہ تھی۔ تازہ اناجیل میں اُسے بدل دیا گیا ہے۔ کم سے کم اُردو کے تراجم میں سے تو اُسے

انجیل میں تحریف کا ایک نمونہ۔

بدل دیا گیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ترجمہ غلط ہوتا رہا ہے۔ مسیح علیہ السلام نے یہ نہیں کہا تُو مجھے کیوں نیک کہتا ہے بلکہ یہ کہا تھا کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اُنیس۱۹ سو سال تک جو غلطی معلوم نہیں ہوئی وہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے اعتراض کے بعد کیونکر معلوم ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دلیرانہ تحریف ہے۔ جو اس زمانہ میں جبکہ پریس کو ایجاد ہوئے سینکڑوں سال گذر گئے ہیں اور کروڑوں اناجیل ہر زبان میں شائع ہو چکی ہیں کی گئی ہے۔ جو قوم اس قدر دلیرانہ تحریف پریس کی ایجاد کے بعد کر سکتی ہے اس سے پریس سے پہلے تحریف کی کیا کچھ امید نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ سب کچھ بائبل کے بیان کے مطابق ہے۔ ورنہ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے اسلام کے نزدیک تو سب ہی بچے نیک فطرت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ خصوصاً اللہ تعالیٰ کے انبیاء خواہ مسیحؑ ہوں یا موسیٰؑ یا اور کوئی۔ سب کے سب کے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے مسیح علیہ السلام کو کوئی خصوصیت حاصل نہ تھی۔

ورثہ میں گناہ کے ملنے کی حقیقت۔

مسیح کے کفارہ کی دوسری بنیاد اور اس کا انہدام

اس بارہ میں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسیحؑ کے کفارہ کی دوسری بُنیاد اس پر ہے کہ وہ لوگوں کی خاطر اور ان کے گناہ اُٹھانے کے لئے صلیب پر لٹک کر مرے۔ صلیب پر لٹک کر مرنے کی نسبت تو آگے چل کر متعلقہ آیات کے ماتحت لکھا جائیگا۔ اس جگہ کے مناسب حال میں صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ نہ تو مسیحؑ کا اپنی مرضی سے صلیب پر لٹکنا انجیل سے ثابت ہے نہ اُن کا صلیب پر مرنا۔ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حضرت مسیح ساری رات اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ وہ اُن کو صلیب سے بچالے۔ چنانچہ لکھا ہے "پھر آگے بڑھ کے (مسیح علیہ السلام) مُنہ کے بل گرا۔ اور دُعا مانگتے ہوئے کہا کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے گذر جائے۔ تو بھی میری خواہش نہیں بلکہ تیری خواہش کے مطابق ہو" (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) کیا عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ جو شخص آسمان سے گنہ گاروں کے گناہ اُٹھانے کے لئے اپنی مرضی سے آیا۔

وہ اس طرح زور و کر اور سجدہ میں گر گر اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح نے ساتھ یہ بھی تو کہا کہ خدا کی مرضی ہو بیشک ایسا ہی لکھا ہے مگر اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ مسیح کی اپنی مرضی لوگوں کے گناہ کا کفارہ بننے کی نہ تھی پھر وہ کفارہ ہو کس طرح گیا۔ کیا خدا تعالےٰ نے ظلماً ایک انکاری شخص کے کندھوں پر لوگوں کا بوجھ ڈال دیا۔ مسیح کی شدت مخالفت تو ہم اس حد تک دیکھتے ہیں کہ جب اُسے صلیب پر لٹکا یا گیا تو بقول اناجیل اُس نے کہا "ایلی۔ ایلی۔ لما سبقتانی" (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اس حوالہ سے تو اس تشریح کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو مسیحی پہلے حوالہ کی کرتے ہیں یعنی مسیح علیہ السلام نے خدا کی مرضی کو مقدم کر لیا تھا کیونکہ انجیل کہتی ہے کہ جب خدا کی مرضی ظاہر ہو ہی گئی اور مسیح صلیب پر لٹک گئے۔ تو انہوں نے بجائے رضامندی ظاہر کرنے کے خدا تعالیٰ سے نعوذ باللہ شکوہ کرنا شروع کر دیا کہ تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح کسی صورت میں بھی صلیب پر لٹکا یا جانا نہیں چاہتے تھے پس یہ کہنا کہ وہ انسانوں کے گناہ اُٹھانے کے لئے اس دُنیا میں آئے تھے۔ بالکل باطل ہے۔ اگر وہ اس غرض کے لئے دُنیا میں آئے ہوتے تو کبھی اس واحد ذریعہ سے جو مسیحیوں کے خیال میں لوگوں کو گناہ سے بچانے کا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہ کرتے۔

انجیل سے اس بات کا ثبوت کہ مسیح نہ صلیب پر اپنی مرضی سے لٹکے۔ اور نہ ہی صلیب پر انہوں نے وفات پائی

اب رہا دوسرا سوال کہ کیا مسیح علیہ السلام واقعہ میں صلیب پر فوت ہوئے؟ سو اس بارہ میں اختصاراً خود حضرت مسیح علیہ السلام کی شہادت یہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس فقیہوں اور فریسیوں کا ایک وفد آیا اور درخواست کی کہ انہیں ایک نشان دکھایا جائے۔ اس پر حضرت مسیح نے فرمایا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائے گا۔ کیونکہ جیسا یونس تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔" (متی باب ۱۲ آیت ۳۹ تا ۴۰) یونس نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گئے تھے اُسکے پیٹ میں زندہ رہے تھے اور اس کے پیٹ سے زندہ ہی نکلے تھے۔ پس معلوم ہُوا کہ مسیح علیہ السلام بھی قبر میں زندہ ہی گئے اور زندہ ہی رہے اور یہ خیال کہ مسیح صلیب پر مر گئے تھے ایک باطل خیال ہے اور جب وہ مرے ہی نہیں تو اُن کا دوسروں کے گناہوں کی خاطر موت قبول کرنے کا مسئلہ بھی سراسر باطل ٹھہرا۔ اب ہم حضرت مسیح کو نعوذ باللہ جھوٹا کہیں یا اُن لوگوں کو جو انہیں صلیب پر مار کر قبر میں مُردہ ہی کی حیثیت میں داخل کرتے ہیں اور مردہ ہی کی حیثیت میں رکھتے ہیں۔

یہود پر انسانی قربانی کا اثر

اس موقعہ پر یہ لطیفہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ باوجود اس کے کہ انسانی قربانی ان معنوں میں کہ لوگ خود کسی انسان کو پکڑ کر اپنے گناہوں کے کفارہ کے طور پر قتل کر دیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے موقوف ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہود اس کے اثر سے بالکل آزاد نہ تھے۔ چنانچہ کتاب قاضیوں باب ۱۱ میں لکھا ہے کہ اسرائیلی سردار افتاح جب بنو عمون سے لڑنے کو نکلا تو اُس نے نذر مانی کہ اگر خدا تعالیٰ اُسے فتح دے تو سب سے پہلی چیز جو اُسے اُس کے گھر سے نکلتی ملے گی وہ اُسے قربان کرے گا۔ اس کی واپسی پر اُس کی لڑکی جو اُس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُسے سب سے پہلے ملی۔ اور اس نے اُسے قربان کر دیا۔ اس قسم کی نذر بھی ایک قسم کا کفارہ ہوتا ہے۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر ہمارے گناہ ہماری کامیابی کے راستہ میں روک بنتے ہیں تو اُن کے اثر کو دُور کرنے کے لئے ہم انسانی قربانی پیش کریں گے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ کوئی جان کسی جان کی قائم مقام کے طور پر خدا تعالےٰ کے حضور میں پیش نہیں ہو سکتی نہایت سچا اور عقل کے مطابق دعویٰ ہے۔ اور خود یہود اور نصاریٰ کی کتب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال اس کے مؤید ہیں۔ اور اس کے برخلاف جو خیالات یہود اور نصاریٰ میں پائے جاتے ہیں صرف ایک باطل خواہش کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے اپنے

بزرگوں کو اپنے گناہوں کے بدلہ میں قربانی کے طور پر پیش کرکے ان بزرگوں کی سخت ہتک کی ہے اور گناہ کا دروازہ بہت وسیع کر دیا ہے۔

شفاعت دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ اُس دن کوئی شفاعت بھی کسی کی طرف سے قبول نہ کی جائے گی۔ یہ بھی یہود و نصاریٰ کے رائج الوقت خیالات کے رد میں ہے۔ یہود نسبی شفاعت کے قائل تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اُن کا اولادِ ابراہیم میں سے ہونا ان کے لئے شفاعت کا موجب ہوگا۔ اور اس تعلق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں کوئی سزا نہیں دے گا۔ یا اگر سزا دیگا تو نہایت محدود۔ قرآن کریم میں آگے چل کر اسی صورت میں اُن کے اس دعویٰ کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر ہے وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ ع۹) یعنی یہود کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند گنتی کے دنوں سے زیادہ کسی صورت میں نہ چھوئے گی۔ یہود کے اس خیال کے متعلق ریورنڈ سیل رکوع ۹ کی مذکورہ بالا آیت کے نیچے اپنے ترجمۂ قرآن میں لکھتے ہیں کہ زمانہ حال کے یہود کا یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے کہ کوئی یہودی سوائے داتن اور ابیرام اور دہریوں کے دوزخ میں گیارہ مہینوں یا حد سے حد ایک سال سے زیادہ نہ رہے گا۔ پرانے لٹریچر میں مجھے اس بارہ میں کوئی حوالہ نہیں مل سکا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ کی کتب تو بہت کچھ مٹ چکی ہیں اور زمانۂ حال کے مصنفین اس غلط خیال میں مبتلا ہیں کہ یہود کلّی طور پر اور قومی طور پر بعث بعد الموت کے منکر ہیں۔ اور اس وجہ سے بعد الموت زندگی کی نسبت انہوں نے کاوش کرکے یہودی خیالات کو معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہود بعد الموت زندگی کے قائل تھے چنانچہ اوپر کی آیت بھی اسی پر شاہد ہے اور اور کئی آیات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اوپر کی آیات کے مفہوم کی تشریح کے سلسلہ میں بعض احادیث اسلامی کتب میں آتی ہیں جو اس امر کی مزید وضاحت کر دیتی ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن جریر حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ دُنیا کی عمر سات ہزار سال ہے اور ہر ہزار سال کے مقابل پر ہمیں ایک دن کا عذاب ملے گا۔ اس کے بعد ہمارا عذاب ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کہ بعض یہود کا خیال ہے کہ انہیں صرف چالیس دن تک دوزخ کا عذاب ملیگا کیونکہ انہوں نے چالیس دن تک بچھڑے کی پرستش کی تھی (سوائے داتن اور ابیرام کے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بغاوت کی تھی۔ اور وہ ہلاک کر دیئے گئے تھے اور سوائے دہریوں کے) حضرت ابن عباسؓ کی روایات میں جو دنوں کے بارہ میں اختلاف ہے کسی روایت میں سات دن بیان ہوئے ہیں اور کسی میں چالیس دن۔ یہ اختلاف یہود کے مختلف قبائل کے مختلف خیالات کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے بہرحال ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے زمانہ میں بعث بعد الموت کے قائل تھے مگر اُن کا خیال تھا کہ بوجہ اولادِ ابراہیم ہونے کے وہ لمبی سزا نہیں پائیں گے۔ اور یہ خیال اُن کا کم سے کم کئی صدی پُرانا تھا کیونکہ عرب میں رہنے والے یہود چند صدی پہلے سے عرب میں آکر بسے تھے۔ پس اُنکے وہ خیالات جو دوسرے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں (دیکھو حوالہ سیل) بہرحال چند صدی پہلے کے ہی تسلیم کرنے پڑیں گے۔

۲۰۱ شفاعت کے متعلق یہودیوں کے خیالات

عہد نامہ قدیم میں بعث بعد الموت کا ذکر

غور سے دیکھا جائے تو عہد نامۂ قدیم سے بھی بعد الموت زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی مذہب اس بارہ میں تعلیم دینے کے بغیر مکمل کہلا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ بعد الموت زندگی ہی انسانی پیدائش کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے اس ذریعہ کے علم سے محروم رکھنا گویا مذہب کی غرض سے محروم رکھنا ہے۔ پس جو مذہب اس تعلیم میں کوتاہی کرتا ہے اپنے خلاف خود گواہی دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی کتاب استثناء باب ۳۱ آیت ۱۶ میں لکھا ہے "تب خداوند نے موسیٰ کو فرمایا دیکھ تو اپنے باپ دادوں کے

ساتھ سو رہے گا۔" اس کے معنے صاف ہیں کہ مرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رُوح اپنے باپ دادوں کے ساتھ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جسمانی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی قبر وہاں نہیں بنی جہاں کہ اُن کے باپ دادوں کی تھی۔ کیونکہ وہ جنگل میں فوت ہوئے اور اُن کی قبر کا ظاہری نشان تک نہیں ملتا۔ تورات میں لکھا ہے "آجکے دن تک کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا (استثناء باب ۳۴ آیت ۶) پس معلوم ہوا کہ باپ دادوں کے ساتھ سونے سے مراد اُس جگہ رہنے کے ہی ہیں۔ جہاں ان کی رُوحیں موت کے بعد رہتی ہیں۔

اسی طرح تورات میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اور اس پہاڑ پر جس پہ تو جاتا ہے مرجا اور اپنے لوگوں میں شامل ہو جیسے تیرا بھائی ہارون حور کے پہاڑ پر مرگیا اور اپنے لوگوں میں جا ملا۔" (استثناء باب ۳۲ آیت ۵۰) اس حوالے سے بھی جسمانی موت کے بعد ایک اور زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ نیک ارواح کسی خاص جگہ پر اکٹھی رکھی جاتی ہیں۔ ورنہ مرنے کے بعد اپنے باپ دادوں سے جا ملنے کے معنے ہی کیا ہوئے۔

حضرت ایوبؑ فرماتے ہیں کاش میں اُن بچوں کی طرح ہوتا جنہوں نے اُجالا نہیں دیکھا یعنی بڑی عمر کو نہیں پہنچے۔ پھر ان کی حالت کی نسبت فرماتے ہیں "وہاں شریر ستانے سے باز آتے اور تھکے ماندے چین سے ہیں وہاں اسیر مل کے آرام کرتے ہیں اور ظالم کی آواز پھر نہیں سُنتے۔ چھوٹے بڑے وہاں برابر ہیں۔ اور غلام اپنے آقا سے آزاد" (ایوب باب ۳ آیت ۱۷ تا ۱۹) ان آیات سے بھی ایک دوسری زندگی کا پتہ ملتا ہے۔

یہودیوں کے شفاعت کا عقیدہ تراشنے کی وجہ۔

حضرت داؤدؑ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں "تو میری جان کو قبر میں رہنے نہ دے گا اور تُو اپنے قدوس کو سڑنے نہ دے گا تو مجھ کو زندگانی کی راہ دکھلائے گا۔" (زبور باب ۱۶ آیت ۱۰ و ۱۱)

اسی طرح حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں "ان لوگوں سے ے خداوند جو تیرے ہاتھ ہیں دُنیا کے لوگوں سے جن کا بَخرہ اسی زندگانی میں ہے اور جن کے پیٹ تو اپنی نہانی چیزوں سے بھرتا ہے انکی اولاد بھی سیر ہوتی اور وے اپنی باقی دولت اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ پر میں جو ہوں صداقت میں تیرا مونہہ دیکھوں گا۔ اور جب میں تیری صورت پر ہو کے جاگوں گا تو میں سیر ہوؤں گا۔" (زبور باب ۱۷ - آیت ۱۴ و ۱۵)

ان آیات سے ثابت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے نزدیک بعض لوگ اسی زندگی پر تکیہ کرتے ہیں لیکن مومن بعد از موت زندگی پر دھیان رکھتا ہے کیونکہ وہاں اُسے اللہ تعالیٰ کی کامل طور پر زیارت ہوگی اور اسکی رُوح اسی دُنیا میں خدا کی صورت پر ہوگی یعنی کامل الصفات ہوگی۔

پھر حضرت داؤد خدا تعالیٰ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں "اُس نے (یعنی داؤد نے) تجھ سے زندگی چاہی اور تو نے اس کو عمر کی درازی ابد تک بخشی" (زبور باب ۲۱ آیت ۴)

ان حوالجات سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں کی تعلیمات سے بعد از موت زندگی کا ثبوت یقینی طور پر ملتا ہے اور جب ہم قرآن کریم کی شہادت کو ملا کر دیکھیں جو دشمن کے نزدیک بھی کم سے کم زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک معتبر تاریخی شہادت کی حیثیت ضرور رکھتی ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اس بارہ میں زمانہ حال کے محققین کا یہ خیال کہ حضرت مسیحؑ سے پہلے کے اسرائیلی نبیوں کی تعلیم میں بعد از موت زندگی کا ثبوت نہیں ملتا۔ ایک بودا۔ کمزور اور بے دلیل خیال ہے اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔

حق یہ ہے کہ بعد از موت زندگی کی تعلیم یہود میں پہلے سے موجود تھی۔ اور وہ اپنے اعمال سے ڈرتے ہوئے اس زندگی کے عذاب کا خوف دل سے مٹانے کے لئے کچھ حیلے تراشتے تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ بوجہ نبیوں کی اولاد ہونے کے ان کی شفاعت سے ہم عذاب اُخروی سے یا تو کلی طور پر بچ جائیں گے یا بہت محدود عذاب ہمیں ملے گا۔ اللہ تعالےٰ

اس کی نفی فرماتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ شفاعت گناہ پر دلیر کرنے کے لئے نہیں ہوتی۔ ایسی کوئی رعایت تم کو نہ دی جائے گی۔ پس اپنے اعمال کی اصلاح کرو اور خود ساختہ خیالات سے فریب کھا کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ یہود کو شفاعت کے بارہ میں غالباً اس امر سے بھی دھوکا لگا کہ اس دنیا میں پہلے بعض الٰہی عذابوں کا اُن کے متعلق فیصلہ ہوا، پھر نبیوں کی دُعا سے وہ ٹل گئے انہوں نے سمجھا کہ اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔ حالانکہ اس دنیا کو اگلے جہان سے کوئی نسبت نہیں۔ اس دنیا میں عذاب کے ٹلانے سے انسان کو پھر توبہ اور نیکی کا موقعہ مل سکتا ہے مگر دوسری زندگی تو آخری فیصلہ کا مقام ہے۔ وہاں اس قسم کی بخشش کے معنے تو یہ بنتے ہیں کہ دنیوی زندگی کو بالکل عبث قرار دیدیا جائے۔

شفاعت کا خیال مسیحیوں میں بھی پایا جاتا ہے انجیل میں لکھا ہے "اے میرے بچو میں یہ باتیں تمہیں لکھتا ہوں تاکہ تم گناہ نہ کرو۔ اور اگر کوئی گناہ کرے تو یسوع مسیح جو صادق ہے باپ کے پاس ہمارا شفیع ہے اور وہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے۔ فقط ہمارے گناہوں کا نہیں بلکہ تمام دنیا کے گناہوں کا بھی"۔ (یوحنا کا پہلا خط باب ۲ آیت ۱)

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کفارہ اور شفاعت ایک چیز ہیں؟ اگر ایک چیز ہیں تو پھر ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے کے کیا معنے ہیں جہاں تک میرا علم جاتا ہے اس بارہ میں مسیحی کتب خاموش ہیں۔ مگر کفارہ اور شفاعت کے الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے دونوں میں فرق معلوم ہوتا ہے۔ کفارہ سے یہ مراد ہے کہ کسی فعل کے ذریعہ سے کسی دوسرے فعل کے اثر کو مٹا دینا۔ لیکن شفاعت کسی فعل یا بدلہ پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے معنے سفارش کے ہیں خواہ سفارش کرنیوالا گنہگار کے فعل کا کوئی بدلہ نہ دے وہ جج یا فیصلہ کنندہ سے اپنے تعلق کو جتا کر ایک گنہگار کے لئے معافی لیتا ہے۔ میرے نزدیک مسیحیوں نے اس فرق کو نہ سمجھ کر دونوں مطالب کو خلط کر دیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی بھی اور مسیحی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے اور اب بھی ہیں کہ اُن کے بزرگوں کو اللہ تعالیٰ سے جو قرب حاصل ہے اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یا تو اُن کو عذاب دیگا ہی نہیں، یا دیگا تو بہت ہی خفیف سا عذاب دیگا۔ اور اس خیال نے انہیں گناہوں پر دلیر کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے الٰہی صداقتوں پر غور کرنے کی طرف سے اُن کی توجہ ہٹ گئی ہے۔ قرآن کریم اُن کی اس غلطی کو اُن پر آشکار کرکے اُن کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتا ہے اور سچائیوں پر غور کرنے کی قابلیت کو پھر زندہ کرتا ہے۔

اس موقعہ پر ایک اور غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے جو مسیحی مصنف اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق پھیلاتے رہتے ہیں۔ مسیحی مصنف اس آیت اور ایسی ہی اور آیات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک شفاعت کا مسئلہ مسلم نہیں ہے اور یہ کہ شفیع ہونے کی مدعی صرف مسیحؑ کی ذات ہے، رسول کریم صلی اللہ

عیسائیت اور شفاعت

علیہ وسلم قرآن کریم کے رُو سے شفیع نہیں ہیں (وہیری جلد ۱ صفحہ ۳۱۳) اور مسلمان جو اُن کو شفیع کہتے ہیں یہ ان کا خود ساختہ عقیدہ ہے۔ جو بقول اُن کے خلاف قرآن کمزور احادیث پر مبنی ہے۔ یہ خیال مسیحیوں کا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں شفاعت کا مضمون تو جو آیات اس کے متعلق ہیں، اُن کے نیچے انشاء اللہ بیان کروں گا یہاں یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم شفاعت کا منکر نہیں۔ بلکہ اس قسم کی شفاعت کا منکر ہے جو یہودیوں اور مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق ہے ورنہ وہ شفاعت کا قائل ہے چنانچہ

کیا کفارہ اور شفاعت ایک ہی چیز ہے؟

اسی سورۃ میں آگے چل کر یہ الفاظ موجود ہیں مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ ع ۳۴) یعنی کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے۔ اسی طرح فرماتا ہے لَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (زخرف ع ۷) یعنی جنکو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انہیں شفاعت

کیا قرآن کریم شفاعت کا منکر ہے؟

کا کوئی اختیار نہیں ہاں شفاعت کا حق ہمارے اس بندے کو حاصل ہے جو حق کی گواہی دے رہا ہے اور یہ اس حق کی گواہی دینے والے کو جانتے ہیں۔ پس قرآن کریم شفاعت کا قائل ہے وہ صرف اس غیر معقول شفاعت کا منکر ہے جو لوگوں کو گناہوں پر دلیر کرتی ہے اور سچائیوں پر غور کرنے سے باز رکھتی ہے۔

نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تمکو فرعون کی قوم سے اس حالت میں نجات دی کہ وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہی

الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ

تھی تمہارے لڑکوں کو (ایک ایک کرکے) ذبح کرتی تھی اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتی تھی

آیت زیرِ تفسیر کے الفاظ بھی اس بارہ میں ہماری ہدایت کے لئے کافی ہیں۔ اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ کوئی شفاعت نہ ہوگی بلکہ یہ فرمایا ہے کہ کسی شخص کی طرف سے شفاعت قبول نہ کیجائیگی گویا مجرم کی طرف سے شفاعت کے پیش ہونے کو رد کیا گیا ہے۔ مجرد شفاعت کو رد نہیں کیا گیا۔

ولا یؤخذ منہا عدلٌ میں یہود کی ایک اور غلطی کا رد

وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ۔ اس جملہ میں یہود و نصاریٰ کی تیسری غلطی کا جو ان کو گناہوں پر دلیر کرتی ہے رد کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ گنہگار اپنے گناہوں کا بدلہ دے کر گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ یہود اور نصاریٰ دونوں میں گناہوں کا بدلہ دینے کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ رومن کیتھولک مسیحیوں میں یہود سے بھی زیادہ یہ عقیدہ ہے۔ جب ان میں سے کسی سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ پادری کے پاس جاتا ہے اور وہ کچھ سزا اس کے لئے مقرر کر دیتا ہے جب وہ اس سزا کو بھگت لے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کا گناہ معاف ہو گیا۔ یہود بھی قربانیوں وغیرہ کے ذریعہ سے گناہوں کا بدلہ دینے کے عادی تھے اور ہیں۔ اسلام گناہوں کا اس قسم کا بدلہ تسلیم نہیں کرتا وہ تو گناہ کی معافی گناہ سے نفرت اور آئندہ کے اجتناب سے متعلق قرار دیتا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ اس کے سوا گناہ کی معافی کی کوئی صورت نہیں کسی کو قتل کرکے کوئی شخص صدقہ دیدے تو اس سے اس کا یہ گناہ کس طرح معاف ہو جائے گا۔ یا گرجا میں بیٹھ کر کچھ روزے رکھ لے تو یہ مقصد کس طرح حاصل ہو سکیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے بھی بعض غلطیوں کے لئے دوسرے اعمال کو بطور کفارہ قرار دیا ہے لیکن یہ وہ غلطیاں ہیں جو عبادت کی ظاہری شکل کے بارہ میں ہیں۔ بندوں کی حق تلفی یا خدا تعالیٰ کی حق تلفی کے بارہ میں ایسی کوئی تعلیم اسلام کی نہیں۔ مثلاً کسی شخص سے حج کا کوئی رُکن رہ گیا تو اس کے بدلہ میں کسی اور نیکی کا حکم دیدیا گیا ہے یا نادانستہ قتل ہو گیا ہے تو اُسے ایک اور عمل بتا دیا گیا ہے یہ اس لئے نہیں کہ اس دوسرے عمل نے گناہ کو دور کر دیا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ظاہری شکل کی غرض کسی اور طرح پوری ہو جائے یا انسان ہوشیار ہو جائے اور آئندہ بے احتیاطی سے بھی کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو۔

ولا ہم ینصرون کی تشریح

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان تین طریق کے سوا کوئی اور غیر طبعی طریق بھی انسان کو بچا نہیں سکتا۔ اس کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی طریق ہے کہ انسان صداقت کو سمجھنے اور اُسے قبول کرنے کے لئے پورا زور لگائے اور جہاں تک اس میں طاقت ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لائے۔ اور اس کی آواز پر لبیک کہتا رہے۔ پس یہود و نصاریٰ کو چاہیئے کہ خود ساختہ طریقوں پر انحصار نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نئی صداقت آئی ہے اُسے قبول کریں ورنہ کوئی اور حیلہ اُن کے کام نہ آئے گا۔

پہلی آیت اور آیت زیرِ تفسیر کا تعلق

پہلی آیت سے اس آیت کا یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ تم کو خدا تعالیٰ نے اپنے زمانہ کے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ اس میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس فضیلت کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ تم خدا تعالیٰ کے شکر گزار اور فرمانبردار بندے بنتے۔ مگر تم اسکے برخلاف اس کی اطاعت کا جوا اُتار پھینکنے کے لئے قسم قسم کے بہانے تلاش کرنے لگ گئے ہو اور خدا تعالیٰ کے فضل کو پیش کرکے

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۝ وَاِذْ فَرَقْنَا

اور تمہارے رب کی طرف سے اس (بات) میں تمہارے لئے) ایک بڑی آزمائش تھی ۵۵ اور (اسوقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے

اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا اور ناواقفوں کو دھوکا دینا چاہتے ہو

۵۵ حل لغات - آل :- آل کے معنے ہیں کنبہ قوم (اقرب) بعض کے نزدیک آل آھل سے مقلوب ہے (مفردات) اور اَھْلُ الرَّجُلِ کے معنے ہیں عَشِیْرَتُهٗ وَذَوُوْ قُرْبَاهُ - آدمی کا کنبہ اور اس کے اقرباء وَاَھْلُ الرَّجُلِ : زَوْجَتُهٗ بعض اوقات اَھْلُ الرَّجُلِ بول کر یہ مراد ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی بیوی - اور جب کسی نبی کے لئے یہ لفظ بولیں اور کہیں اَھْلُ نَبِیٍّ تو اسکے معنے ہوں گے اُمَّتُهٗ نبی کی اُمت - اور اہل بیت کے معنے ہیں گھر میں رہنے والے - اور اَھْلُ الْاَمْرِ ان لوگوں کو کہیں گے جو کسی اہم امور پر متعین ہوں یعنی حکام (اقرب) لیکن اَھْل اور آل کے استعمال میں فرق کیا گیا ہے لفظ آل بڑے انسانوں کی طرف ہی مضاف ہوگا اور کسی نکرہ کی طرف یا کسی زمانے او مکان کی طرف نہیں ہوگا (مثلاً یہ نہ کہیں گے کہ آلِ رَجُلٍ یا آلِ زمانہ یا آلِ بَیْت) لیکن آھل کا لفظ ہر ایک کی طرف مضاف ہو سکتا ہے - نیز آل کا لفظ کسی معزز اور شریف ذات کی طرف ہی منسوب ہوگا بمقابل اَھل کے - کہ وہ معزز اور غیر معزز ہر دو کی طرف مضاف ہو جاتا ہے یعنی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آلُ السُّلْطَانِ یعنی بادشاہ کی قوم اور رعیت - لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ آلُ الْخَیَّاطِ درزی کی آل - ہاں اَھْلُ الْخَیَّاطِ کہہ سکیں گے - مگر لفظ آھل ہر ایک کے ساتھ استعمال ہو سکے گا یعنی اَھْلُ السُّلْطَانِ بھی کہہ سکیں گے اور اَھْلُ الْخَیَّاطِ بھی (مفردات) پس آل فرعون کے معنے ہوئے فرعون کی قوم -

فِرْعَوْن :- لَقَبُ کُلِّ مَنْ مَلَكَ مِصْرَ یعنی لفظ فرعون مصر کے قدیمی بادشاہوں کا لقب ہوا کرتا تھا بعض کے نزدیک ہر سرکش اور متمرد (مغرور) پر فرعون کا لفظ بولا جاتا ہے -

اس کی جمع فَرَاعِنَةٌ ہے (اقرب) لفظ فرعون فَرْعَنَ سے
بنا ہے اور فَرْعَنَ کے معنے ہیں کَانَ ذَا دَھَاءٍ وَنُکْرٍ کہ اس آل
کے اندر ذہانت اور عقلمندی حد درجہ کی پائی جاتی ہے اور تَفَرْعَنَ فُلَانٌ کے معنے ہیں طَغٰی وَتَجَبَّرَ سرکش ہوا اور شان و شوکت کا اظہار کیا - اور تَفَرْعَنَ النَّبَاتُ کے معنے ہیں طَالَ وَقَوِیَ کہ کوئی پودا لمبا اور مضبوط ہو گیا (اقرب) فرعون مگرمچھ کو بھی کہتے ہیں (اقرب) گویا مصر کے قدیمی بادشاہوں کا لقب ان کی حد درجہ ذہانت اور بڑھی ہوئی طاقت کی وجہ سے فرعون ہو گیا -

یَسُوْمُوْنَکُمْ :- سَامَ سے مضارع جمع مذکر غائب یسومونکم
کا صیغہ ہے - اور سَامَ فُلَانًا الْاَمْرَ کے معنے ہیں کَلَّفَهٗ اِیَّاهُ کسی کو مشکل اور بامشقت کام کرنے کا حکم دیا - وَاَکْثَرُ مَا یُسْتَعْمَلُ فِی الشَّرِّ وَالْعَذَابِ اور اس فعل کا اکثر استعمال دکھ اور شر پہنچانے کے معنوں میں آتا ہے جب سَامَ الْبَائِعُ السِّلْعَةَ کہا جائے تو اس کے معنے ہوں گے عَرَضَهَا وَذَکَرَ ثَمَنَهَا - سامان کو خریدنے والے پر پیش کیا اور قیمت کا ذکر کیا - جب سَامَهٗ خَسْفًا کہیں تو معنے ہوں گے اَوْلَاهُ اِیَّاهُ وَاَرَادَهٗ عَلَیْهِ کہ اُسے ذلت پہنچائی یا اس پر ذلت پڑنے کی خواہش کی (اقرب) مفردات راغب میں ہے کہ اَلسَّوْمُ کے اصل معنے ہیں اَلذَّھَابُ فِی ابْتِغَاءِ الشَّیْءِ کہ کسی چیز کی تلاش میں جانا فَھُوَ لَفْظٌ لِمَعْنًی مُرَکَّبٍ مِنَ الذَّھَابِ وَالْاِبْتِغَاءِ گویا لفظ سَوْم درحقیقت مرکب معنے رکھتا ہے یعنی کسی جگہ جانا اور کسی چیز کو تلاش کرنا - لیکن بعض اوقات صرف جانے کے معنے میں
استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں سَامَتِ الْاِبِلُ کہ اونٹ فرعون
چرنے کے لئے گئے - اور کبھی صرف اِبْتِغَاء یعنی چاہنے کے معنے میں - جیسے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کہ وہ

تمہیں بدترین عذاب دینا چاہتے تھے۔ (مفردات) تاج العروس میں ہے کہ سَامَهُ کے معنے ہیں اَلْزَمَهُ وَجَشَّمَهُ اس کے ذمہ کوئی کام لگایا اور اسے اس کام کے کرنے کی تکلیف دی (تاج)

العذاب اَلْعَذَاب:۔ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرہ ۵ پس یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کے معنے ہوں گے (۱) وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہے تھے۔ (۲) وہ تمہیں بدترین عذاب دینا چاہتے تھے۔

یذبّحون یُذَبِّحُوْنَ:۔ ذَبَّحَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ذَبَّحَ ذَبَحَ سے باب تفعیل ہے ذَبَحَ کے معنے ہیں شَقَّ پھاڑ دیا۔ نیز اس کے معنے ہیں فَتَقَ توڑ دیا۔ خَنَقَ گلا گھونٹ کر مار دیا نَحَرَ ذبح کیا (اقرب) لسان میں ہے اَلذَّبْحُ قَطْعُ الْحُلْقُوْمِ ذَبَحَ کے معنے ہیں گلا کاٹنا (لسان) تاج العروس میں ہے اَلذَّبْحُ: اَلْهَلَاكُ کہ ذبح کے ایک معنی ہلاک کر دینے یا مار دینے کے ہیں (تاج) اس جگہ ذَبَحَ کے معنے مارنے یا گلا گھونٹ کر مارنے کے ہیں۔ پس یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کے معنے ہوں گے (۱) وہ تمہارے لڑکوں کو مار دیتے تھے (۲) وہ تمہارے لڑکوں کو گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے۔

یستحیون یَسْتَحْيُوْنَ:۔ اِسْتَحْيَا سے مضارع جمع مذکر غایب کا صیغہ ہے اور اِسْتَحْيَاهُ کے معنے ہیں اَبْقَاهُ حَيًّا اُسے زندہ رہنے دیا۔ نیز لکھا ہے قَالَ اللِّحْيَانِيُّ اِسْتَحْيَاهُ اِسْتَبْقَاهُ وَلَمْ يَقْتُلْهُ کہ لحیانی کہتے ہیں اِسْتَحْيَاء کے معنے ہیں کہ اُسے زندہ رہنے دیا اور اُسے قتل نہ کیا (لسان) پس یَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ کے معنے ہوں گے کہ وہ تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور قتل نہ کرتے تھے۔

بلاء بَلَآءٌ:۔ بَلَوْتُ الرَّجُلَ (بَلَآءً وَ بَلْوًا) وَابْتَلَيْتُهُ کے معنے ہیں اِخْتَبَرْتُهُ میں نے اس کا امتحان لیا اور اِبْتَلَاهُ اللّٰهُ کے معنے ہیں اِمْتَحَنَهُ اللہ نے اس کا امتحان لیا۔ اور اس سے اِسْم اَلْبَلْوٰی۔ اَلْبَلْوَةُ۔ اَلْبَلِيَّةُ اور اَلْبَلَآءُ آتا ہے یعنی امتحان۔ نیز لکھا ہے اَلْبَلَآءُ يَكُوْنُ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ کہ بلاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ بلائے خیر بھی اور بلائے شر بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اِبْتَلَيْتُهُ بَلَآءً حَسَنًا وَّ بَلَآءً سَيِّئًا کہ میں نے اس کا اچھا امتحان لیا اور بُرا امتحان لیا۔ پھر لکھا ہے وَاللّٰهُ تَعَالٰى يَبْلِي الْعَبْدَ بَلَآءً حَسَنًا وَّيَبْلِيْهِ بَلَآءً سَيِّئًا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا امتحان ہر دو طرح سے لیتا ہے بلاءِ انعام سے بھی اور بلاءِ تکلیف سے بھی۔ نیز اَلْبَلَآءُ کے معنے انعام کے بھی لکھے ہیں (لسان) اَلْبَلَآءُ کے اصل معنے امتحان کے ہوتے ہیں۔ لیکن امتحان چونکہ کبھی انعام کے ذریعہ سے اور کبھی سزا کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے اس لئے بَلَاء کے اندر دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ انعام کا امتحان بھی اور تکلیف کا امتحان بھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ (اعراف ع ۲۱)

عظیم عَظِيْمٌ:۔ عَظِيْمٌ عَظُمَ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور عَظُمَ الشَّيْءُ عِظَمًا وَّعَظَامَةً کے معنے ہیں كَبُرَ کوئی چیز بڑی ہو گئی۔ جب کہیں کہ عَظُمَ الْاَمْرُ عَلٰى فُلَانٍ تو اس کے معنے ہوتے ہیں شَقَّ وَصَعُبَ یعنی فلاں کام اس پر برداشت کرنا مشکل اور گراں ہو گیا (اقرب) پس عَظِيْمٌ کے معنے ہوں گے (۱) بڑا (۲) گراں۔ مشکل۔

تفسیر۔ اس آیت سے ان احسانات کی تفصیلات گنوانی شروع کی ہے جو ایک لمبے عرصہ سے بنی اسرائیل پر ہوتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ پہلا احسان یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل مصر کے فراعنہ کے ماتحت غلاموں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے تب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے موسیٰ کو بھیجکر اس عذاب سے اُن کو نجات دلوائی۔ بائبل میں بنی اسرائیل کی اس غلامانہ زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ "مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں۔ تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک

بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ

تمہارے لئے سمندر کو پھاڑا پھر ہم نے تمہیں نجات دی اور تمہاری نظروں کے سامنے فرعون کی قوم کو

وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○ وَإِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى أَرْبَعِيْنَ

غرق کر دیا ۵۱ اور (اسوقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس

نکل جاویں۔ اس لئے انہوں نے اُن پر خراج کے لئے محصل بٹھلائے "تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے ستاویں... اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی۔ اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے انکی زندگی تلخ کی۔ انکی ساری خدمتیں جو وہ کراتے تھے مشقت کی تھیں" (خروج باب ۱ آیت ۸ تا ۱۴)۔

يُذَبِّحُوْنَ أَبْنَآءَكُمْ۔ رعمسیس ثانی جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے بنی اسرائیل کا سخت دشمن تھا اور بنی اسرائیل کی ترقی دیکھ کر اس نے ان کے لڑکے قتل کرنے کا حکم دیدیا تھا۔ مگر دائیوں کی نرم دلی کی وجہ سے اس ارادہ میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہوا۔ اور آخر اس نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے لڑکے دریا میں پھینک دیئے جایا کریں۔ اور لڑکیاں بچالی جائیں۔" (خروج باب ۱ آیت ۲۲) طالمود میں بھی اسی مضمون کی روایات ہیں۔

اسی طرح اعمال باب ۷، آیت ۱۹ میں لکھا ہے :-

"یہانتک کہ اس نے (فرعون نے) ان کے لڑکوں کو پھینکوا دیا تاکہ جیتے نہ رہیں۔"

بعض لوگوں نے اس آیت میں ذبح کے لفظ سے دھوکا کھایا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بنی اسرائیل کے بچوں کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا۔ حالانکہ تاریخ کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ ان لوگوں کے دھوکا کھانے کی یہ وجہ ہے کہ ذبح کا لفظ گلا کاٹ دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے معنے ہلاک کر دینے کے بھی ہیں جن کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ان معترضوں کو دھوکا لگا ہے۔ چنانچہ تاج العروس جلد ۲ صفحہ ۱۳۸ پر لکھا ہے۔ وَالذَّبْحُ : اَلْهَلَاكُ۔ یعنی ذبح کے ایک معنی ہلاکت کے بھی ہیں۔ پس يُذَبِّحُوْنَ أَبْنَآءَكُمْ کے یہ معنے نہیں کہ وہ تمہارے لڑکوں کا گلا کاٹ دیتے تھے بلکہ یہ معنے ہیں کہ وہ تمہارے لڑکوں کو ہلاک کرتے تھے۔ چنانچہ سورۃ اعراف آیت ۱۴۲ میں يُذَبِّحُوْنَ أَبْنَآءَكُمْ کی بجائے يُقَتِّلُوْنَ أَبْنَآءَكُمْ کے الفاظ رکھ کر قرآن کریم نے يُذَبِّحُوْنَ کے معنے خود ہی کر دیئے ہیں کہ اس سے مراد گلا کاٹنا ہی نہیں بلکہ مار دینا ہے خواہ کسی طرح سے ہو۔

بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کے متعدد احسانات اور ان کی تفصیل۔

پہلا احسان بنی اسرائیل کو غلامانہ زندگی سے نجات دلوانا۔

اول يذبحون ابناءكم کے معنے لڑکوں کو ہلاک کرنے کے۔

بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ۔ ایسے عذاب سے نجات دینے میں تمہارے لئے بڑا انعام تھا۔ یہ نجات بہت سے انعامات کا موجب ہوئی۔

حل لغات اسے فَرَقْنَا : فَرَقَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ کے معنے ہیں فَلَقْنَاهُ ہم نے سمندر کو پھاڑا۔ (اقرب)

فرقنا۔

تَنْظُرُوْنَ : نَظَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور نَظَرَهٗ وَاِلَيْهِ کے معنے ہیں أَبْصَرَهٗ وَتَأَمَّلَهٗ بِعَيْنِهٖ کسی پر اچانک نظر پڑنے کے بعد غور سے اسے دیکھنے کے لئے ٹکٹکی لگائی۔ نیز نَظَرَهٗ کے معنے ہیں۔ مَدَّ طَرْفَهٗ اِلَيْهِ رَآهُ أَوْ لَمْ يَرَهٗ کسی کیطرف آنکھ اٹھائی۔ خواہ پھر اسے دیکھ سکا یا نہ دیکھ سکا۔ (دونوں حالتوں میں

تنظرون۔

نَظَرَ کا لفظ اس پر بول سکتے ہیں) نیز کہتے ہیں نَظَرَ فِی الْاَمْرِ نَظَرًا - اور معنے یہ ہوتے ہیں کہ تَدَبَّرَہٗ وَ تَفَکَّرَ فِیْہِ یُقَدِّرُہٗ وَ یُقِیْسُہٗ نظر کے یہ بھی معنے ہیں کہ کسی امر پر غور کیا اور کسی معاملہ کو کسی اور معاملہ پر قیاس کرکے غور و فکر سے اپنی رائے قائم کی جب نَظَرَ بَیْنَ النَّاسِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَکَمَ وَ فَصَلَ دَعَاوِیْہِمْ لوگوں کے جھگڑوں کا سوچ بچار کر فیصلہ کیا، اور یہ بتایا کہ انہیں سے اپنے دعوے میں صادق کون تھا - اور جب نَظَرَ لِلْقَوْمِ بولا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے رَقَّ لَہُمْ وَ اَعَانَہُمْ کہ لوگوں کو مصائب و مشکلات میں پھنسا دیکھ کر دل میں رحم پیدا ہوا اور انکی مدد کی - نَظَرَ الشَّیْءَ کے ایک معنے اِنْتَظَرَہٗ کے بھی ہیں یعنی انتظار کیا. نیز اہل عرب کہتے ہیں دَارِیْ تَنْظُرُ اِلٰی دَارِ فُلَانٍ اَیْ تُقَابِلُہَا یعنی میرا گھر فلاں کے گھر کے بالمقابل ہے - (اقرب)

فرقنا بکم البحر کے معنے کرنے میں مفسرین کا غلطی کھانا اور اس کے صحیح معنے۔

پس تَنْظُرُوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) تم آلِ فرعون کا غرق ہونا دیکھ رہے تھے - (۲) تم آل فرعون کے غرق ہونے کو دیکھ کر ان کے دعاوی کے جھوٹا ہونے اور اپنے دعاوی کے سچا ہونے کا فیصلہ کر رہے تھے . (۳) تم آل فرعون کے غرق ہونے پر رحم کھا رہے تھے کہ کاش وہ بدیاں نہ کرتے - اور ہلاکت تک نوبت پہنچتی - (۴) تم انکی ہلاکت کے منتظر تھے - (۵) ہم نے آل فرعون کو اسوقت غرق کرکے ہلاک کر دیا جب کہ تم بالکل ان کے بالمقابل تھے .

۲ فرقنا بکم البحر میں بنی اسرائیل کے سمندر سے ہو کر بچ نکلنے کے معجزہ کیطرف اشارہ

تفسیر - فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ کے لفظی معنے ہیں . جبکہ ہم نے تمہارے ذریعہ سے سمندر کو پھاڑا اور ان معنوں سے دھوکا کھا کر اکثر مفسرین نے آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ بنی اسرائیل دریا پھاڑنے کا ذریعہ تھے - انکو دریا میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا - تو جوں جوں وہ آگے بڑھتے تھے دریا کا پانی سمٹتا جاتا تھا - لیکن یہ معنے خود قرآن کریم کے الفاظ سے غلط ثابت ہوتے ہیں - قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (الشعراء عٔ) یعنی ہم نے موسیٰؑ سے وحی کی کہ تو سمندر پر سونٹا مار - جب اس نے سونٹا مارا تو سمندر پھٹ گیا - اور ہر ٹکڑا ایک اونچے ٹیلے کیطرح نظر آتا تھا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کے پھٹنے کا ذریعہ ظاہر میں سونٹا تھا نہ کہ بنی اسرائیل پس یہ معنے کہ بنی اسرائیل کے ذریعہ سے سمندر کو پھاڑا باطل ہوئے - اب یہ سوال ہے کہ اس کے معنے کیا ہیں ؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ بَاء عربی زبان میں تعلیل اور سببیت کے لئے بھی آتی ہے - اور آیت کے معنے یہ ہیں - کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو پھاڑا - یعنی تمہیں نجات دینے کے لئے ہم نے ایسا کیا - دوسرے الفاظ میں فَرَقْنَا لَکُمُ الْبَحْرَ کے معنوں میں فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ آیا ہے - (دیکھو بحر محیط کشاف شرح مائۃ عامل) ؎

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ - اس آیت میں اس معجزہ کیطرف اشارہ کیا گیا ہے جو حضرت موسےٰؑ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُسوقت دکھایا جبکہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کیطرف لیجا رہے تھے - اور ان کو واپس لیجانے کے لئے فرعون اپنے لشکروں سمیت ان کا تعاقب کر رہا تھا - خروج باب ۱۴، آیت ۲۱ تا ۳۱ میں لکھا ہے :-

"پھر موسےٰ نے دریا پر ہاتھ بڑھایا - اور خداوند نے بہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا اور پانی کو دو حصے کیا - اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کے گذر گئے - اور پانی کی ان کے دہنے اور بائیں

دیوار تھی۔ اور مصریوں نے پیچھا کیا۔ اور ان کا پیچھے کئے ہوئے دَوڑے اور فرعون کے سب گھوڑے اور اسکی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے۔ اور یوں ہوا کہ خداوند نے پچھلے پہر اس آگ اور بدلی کے ستون میں سے مصریوں کے لشکر پر نظر کی۔ اور مصریوں کی فوج کو گھبرا دیا۔ اور ان کی گاڑیوں کے پہیّوں کو نکال ڈالا۔ ایسا کہ مشکل سے چلتی تھیں۔ چنانچہ مصریوں نے کہا کہ آؤ اسرائیلیوں کے مُنہ پر سے بھاگ جاویں کیونکہ خداوند ان کے لئے مصریوں سے جنگ کرتا ہے۔ اور خداوند نے موسےٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ دریا پر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور انکی گاڑیوں اور ان کے سواروں پر پھر آوے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھایا۔ اور دریا صبح ہوتے اپنی قوت اصلی پر لوٹا۔ اور مصری اس کے آگے بھاگے۔ اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا۔ اور پانی پھرا۔ اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا کے بیچ آئے تھے چھپا لیا۔ اور ایک بھی انمیں سے باقی نہ چھوٹا۔ پر بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے۔ اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اُس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔ اور اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارے پر دیکھیں۔ اور اسرائیلیوں نے بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور لوگ خداوند سے ڈرے۔ تب خداوند پر اور اس کے بندے موسےٰ پر ایمان لائے۔"

قرآن کریم میں یہ واقعہ علاوہ اِس آیت کے سورہ شعراء ع۴ اور سورۂ طٰہٰ ع۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں آتا ہے۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ (الشعراء ع۴) یعنی ہم نے موسیٰ سے وحی کی کہ تو سمندر پر سونٹا مار۔ جب اسنے سونٹا مارا تو سمندر پھٹ گیا۔ اور ہر ٹکڑا ایک اونچے ٹیلے کی طرح نظر آتا تھا۔" پھر سورہ طٰہٰ میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝ (طٰہٰ ع۴) یعنی ہم نے موسیٰ سے وحی کی کہ ہمارے بندوں یعنی بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال لیجاؤ۔ اور سمندر میں سونٹا مار کر ان کے لئے خشک رستہ بنا دو۔ تم اس طرح اس کو پار کرلوگے اور تعاقب سے اور ڈوبنے سے نہ ڈروگے۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ لیکن سمندر کا ریلا کچھ ایسا آیا کہ وہ غرق ہوگئے اور فرعون نے یوں اپنی قوم کو تباہی میں ڈالا اور بچ نہ سکا۔

ان آیات کو ملا کر قرآن کریم کے بیان کے مطابق واقعہ کی کیفیت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ بنی اسرائیل ارض مقدس کے ارادہ سے چلے جارہے تھے کہ پیچھے سے فرعون کا لشکر آپہنچا۔ اسے دیکھ کر بنی اسرائیل گھبرائے اور سمجھے کہ اب ہم پکڑے جائیں گے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی معرفت انکو تسلی دلائی۔ اور حضرت موسیٰ سے کہا کہ اپنا عصا سمندر پر ماریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر میں ایک راستہ ہوگیا۔ اور وہ اسمیں سے آگے روانہ ہوئے۔ ان کے دونوں طرف پانی تھا جو ریت کے ٹیلوں کی مانند یعنی اونچا نظر آتا تھا۔ لشکر فرعون نے ان کا پیچھا کیا۔ مگر بنی اسرائیل کے صحیح سلامت پار ہونے پر پانی پھر لوٹا۔ اور مصری غرق ہوگئے۔

اس واقعہ کے سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تمام معجزات اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور کسی انسان کا انمیں دخل ادا

بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے کا ذکر بائبل میں

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں واقعہ ہذا کا ذکر

قرآن کریم کی آیات کے پیش نظر واقعہ کی کیفیت

تصرف نہیں ہوتا۔ پس حضرت موسیٰؑ کا عصا اٹھانا اور سمندر پر مارنا صرف ایک نشانی کے لئے تھا۔ نہ اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا کا سمندر کے ہٹ جانے میں کوئی دخل تھا اسی طرح یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن کریم کے الفاظ سے ہرگز ثابت نہیں کہ سمندر کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے اور انہیں سے حضرت موسیٰؑ نکل گئے تھے۔ بلکہ قرآن کریم میں اس واقعہ کے متعلق دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک فَرَقَ اور ایک اِنْفَلَقَ کا۔ جن کے معنے جدا ہو جانے کے ہیں۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق اس واقعہ کی یہی تفصیل ثابت ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کے وقت سمندر جدا ہو گیا تھا۔ یعنی کنارہ سے ہٹ گیا تھا اور جو خشکی نکل آئی تھی اس میں سے بنی اسرائیل گزر گئے تھے۔

آیت واذ فرقنا بکم البحر۔ الخ کے متعلق سابق مفسرین کے خیالات۔

اور سمندر کے کناروں پر ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ نپولین کی لائف میں لکھا ہے کہ جب وہ مصر پر حملہ آور ہوا۔ تو وہ بھی اپنی فوج کے ایک حصہ سمیت بحیرۂ احمر کے کنارہ کے پاس جزر کے وقت گذرا تھا۔ اور اس کے گذرتے گذرتے مد کا وقت آ گیا۔ اور وہ مشکل سے بچا۔ اس واقعہ میں معجزہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر کے سامنے پہونچایا جبکہ جزر کا وقت تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ اٹھاتے ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت پانی گھٹنا شروع ہو گیا۔ لیکن فرعون کا لشکر جب سمندر میں داخل ہوا تو ایسی غیر معمولی روکیں اس کے راستہ میں پیدا ہو گئیں کہ اس کی فوج بہت سست رفتار سے بنی اسرائیل کے پیچھے چلی۔ اور ابھی سمندر ہی میں تھی کہ مد آ گئی اور دشمن غرق ہو گیا۔ چنانچہ اس خیال کی تائید قرآن کریم کے الفاظ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (سورہ شعراء آیت ۶۴) بھی کرتے ہیں۔ جن کے یہ معنی ہیں کہ جب سمندر ہٹا۔ تو ہر ایک ٹکڑا ایک اونچے ریتلے ٹیلہ کی طرح ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قرآن کریم کا یہ منشاء ہوتا کہ سمندر دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا تو کُلّ کا لفظ جو نکرہ مفرد پر آیا ہے کبھی استعمال نہ ہوتا۔ پس کُلّ کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ اس واقعہ پر سمندر پھٹا

بنی اسرائیل کیساتھ پیش آمدہ واقعہ کی مثال نپولین کی لائف میں۔

اُلّٰہ
سمندر دو ٹکڑوں میں پھٹا نہ تھا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا

نہ تھا بلکہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ اور جیسا کہ اُن سمندروں میں ہوتا ہے جن کے کناروں پر چھوٹے گڑھے پانیوں کے ہوتے ہیں۔ سمندر کے ہٹنے پر وہ پانی کے سوا تھے پانی سے بھرے رہتے ہیں۔ ایسا ہی اُس وقت ہوا۔ بنی اسرائیل کے ایک طرف سمندر تھا اور ایک طرف وہ چھوٹی چھوٹی جھیلیں جو سمندر کے کنارے پر واقع تھیں۔ اور جیسا کہ قاعدہ ہے درمیان میں گذرنے والوں کو وہ اونچی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ بحیرہ احمر کے نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کنارہ پر بہت سی جھیلیں ہیں جو پرانے زمانہ میں اور بھی زیادہ تھیں۔ جیسا کہ پرانے نقشہ جات سے ثابت ہے۔

جو معنے اس آیت کے میرے نزدیک ہیں انہیں لکھنے کے بعد میں سابق مفسرین کے خیالات بھی لکھ دینے مناسب سمجھتا ہوں۔ سابق مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نیل کا دریا پار کیا تھا۔ اور اس معجزہ کے بارہ میں ان کا مزید خیال یہ ہے کہ دریا بارہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ یہ استدلال وہ سورہ شعراء کی آیت فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ سے کرتے ہیں۔ ان بارہ ٹکڑوں سے اُن کے نزدیک یہ فائدہ تھا۔ کہ بارہ قبائل الگ الگ گذر جائیں۔ اس بارہ میں انہوں نے اسقدر زور دیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب وہ دریا میں سے گذرنے لگے تو چونکہ ہر دو فریق کے درمیان پانی کی دیوار حائل تھی۔ بنی اسرائیل نے دریا میں سے گذرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک دوسرے گروہ ہم کو نظر نہ آئیں گے ہم دریا میں سے نہ گذریں گے۔ آخر موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور خدا تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ پانی کی دیوار میں سونٹا داخل کرو۔ انہوں نے اسی طرح کیا۔ اور دیوار میں سوراخ ہو گیا۔ اور وہ سب ایک دوسرے کی آوازیں سننے لگے اور صورتیں دیکھنے لگے۔ (کشاف) گویا پانی اس طرح بستہ ہو گیا تھا کہ اسمیں قائم رہنے والا سوراخ ہو سکتا تھا۔ اور پھر موسیٰ کا سونٹا اسقدر

لمبا ہوگیا کہ وہ بارہ سڑکیں جس پر یہود کے بارہ قبیلے گذر رہے تھے۔ اُن سب کو ایک ہی وار میں، وہ سونٹا چیر گیا۔ اور سب میں ایک ہی وقت میں سوراخ کر گیا۔ اس سوال پر کسی مفسر نے روشنی نہیں ڈالی، کہ جن بنی اسرائیل میں اسقدر محبت تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہ پاتے تھے اور ایک دوسرے کے متعلق تسلی پائے بغیر موسٰے جیسے نبی کے ساتھ بھی دریا پار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اُن کے لئے بارہ راستے الگ الگ کیوں بنائے گئے تھے؟ وہ ایک ہی راستہ پر سے سب کے سب کیوں نہ گذر سکتے تھے؟ اصل بات یہ ہے کہ مفسرین ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہوئے ہیں کہ وہ اس پانی کو جس سے موسٰے علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر گذرے تھے نیل کا پانی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ امر واقعات سے درست ثابت نہیں ہوتا۔ تاریخ اور آثار قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰی علیہ السلام کے وقت میں جیسا کہ آجکل بھی ہے۔ صدر مقام کی آبادی نیل کے مشرق کی طرف تھی۔ نہ کہ مغرب کی طرف۔ ایک

مختصر نقشہ اسوقت کی آبادی کا نیچے دیا جاتا ہے:۔

اس نقشہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ کنعان جس کی طرف حضرت موسٰے علیہ السلام اور انکی قوم گئی تھی نیل کے شمال مشرق کیطرف ہے۔ اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ فراعنہ کے وقت میں اُن کا صدر مقام گوشن کے علاقہ میں تھا جسے وادی تمیلات بھی کہتے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۲ صفحہ ۲۰۱۲ زیر لفظ جمیسیس)۔ اور یہ وادی دریائے نیل کے مشرق میں ہے اور اس جگہ سے جو شخص کنعان کو جائے اسے دریائے نیل سے گذرنا ہی نہیں پڑتا نیل اس کے مغرب میں رہ جاتا ہے۔ پس اس آیت میں دریائے نیل کے گذرنے کا ذکر نہیں بلکہ کسی دوسرے پانی سے گذرنے کا سوال ہے۔

جس پانی سے حضرت موسٰی اپنی قوم کو لیکر گذرے وہ نیل کا پانی نہیں تھا۔

اور چونکہ اس مقام سے لیکر قادس تک جہاں حضرت موسٰی علیہ السلام گئے تھے کوئی دریا واقع نہیں (جیسا کہ نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے) اس لئے وہ جگہ جہاں سے حضرت موسٰی علیہ السلام اور انکی قوم گذری تھی بہرحال سمندر یا اسکا کوئی بڑھا ہوا حصہ تھا۔

جہاں سے حضرت موسٰے بمعہ ساتھیوں کے گذرے تھے وہ سمندر یا اسکا کوئی بڑھا ہوا حصہ تھا۔

پس یہ معنی کہ ایک بہتا ہوا دریا عصائے موسیٰ کی ضرب سے رک گیا تھا اور اس کے ایک طرف کا پانی ایک طرف سخ ہوکر رہ گیا تھا اور دوسری طرف کا پانی دوسری طرف سخ ہوکر رہ گیا تھا۔ اور اس میں سونٹا مار کر سوراخ کر دیا گیا تھا۔ یہ سب لغو قصے ہیں۔ قرآن کریم انکی تصدیق نہیں کرتا۔ قرآن کریم بَحر اور یَمّ کا لفظ بولتا ہے جو گو دریا کے لئے بھی بول لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کا استعمال سمندر یا نمکین پانی کی جھیل کے لئے زیادہ تر ہوتا ہے۔ اور بنی اسرائیل کے رہنے کے مقام اور کنعان کے درمیان سمندر یا اس کے ٹکڑے ہی آتے ہیں۔ بہنے والا دریا کوئی نہیں آتا۔ پس جس جگہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام گذرے تھے وہ سمندر یا اس کا کوئی بڑھا ہوا ٹکڑا تھا۔

۲ اس سوال کا جواب کہ فرعون نے بنی اسرائیل کا تعاقب خشکی کے راستے سے ہوکر کیوں نہ کیا؟

میں اوپر بتا آیا ہوں کہ سمندر میں مدّ و جزر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک وقت میں پانی کنارے پر سے بہت دور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور دوسرے وقتوں میں وہ خشکی پر اور آگے آجاتا ہے۔ سمندر پھاڑنے کے واقعہ کا اسی مدّ و جزر کی کیفیت سے تعلق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے وقت میں سمندر سے گذرے جبکہ جزر کا وقت تھا اور سمندر پیچھے ہٹا ہوا تھا۔ اس کے بعد فرعون پہنچا۔ وہ بوجہ اس کے کہ کم سے کم ایک دن بعد حضرت موسیٰ کے چلا تھا وہ مارا مار کرتا ہوا جس وقت سمندر پر پہنچا تو اُسوقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اس خشک ٹکڑے کا جس سے وہ گذر رہے تھے۔ اکثر حصہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے انکو پار ہوتے دیکھ کر جلدی سے اس میں اپنی رتھیں ڈالدیں مگر سمندر کی ریت جو گیلی تھی اس کی رتھوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اور اسکی رتھیں اسمیں پھنسنے لگیں۔ اور اسقدر دیر ہوگئی کہ مدّ کا وقت آگیا اور پانی بڑھنے لگا۔ اب اس کے لئے دونو باتیں مشکل تھیں۔ نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر نے اسے درمیان میں آلیا۔ اور وہ اور

۱ حضرت موسیٰ ایسے وقت میں سمندر سے گذرے جبکہ جزر کا وقت تھا۔

۱ فرعون کی غرقابی کے وقت سمندر کی مدّ کی حالت تھی۔

اس کے بہت سے ساتھی سمندر میں غرق ہوگئے۔ اور چونکہ مدّ کا وقت تھا سمندر کا پانی جو کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا اس نے ان کی لاشوں کو خشکی کی طرف لا پھینکا۔

اس امر کا جواب کہ اگر صرف مدّ و جزر سے فائدہ اٹھا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گذرے تھے تو اس میں معجزہ کیا ہوا اوپر گذر چکا ہے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں فرعون اوپر کی طرف سے ہوکر خشکی کے راستہ نہ گیا اور کیوں اس نے سمندر کی خشک جگہ میں سے ہوکر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندر کے اس مقام کے پاس جو غالباً سویز شہر کے پاس تھا (یہاں سمندر کی چوڑائی صرف ۲/۱ میل ہے۔ دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا صفحہ ۱۴۳۴)۔ بہت سی جھیلیں ہیں اور دلدلیں بھی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے۔ پہلے اوپر کی طرف گئے تھے مگر آگے جھیلوں کو راستہ میں دیکھ کر اور راستہ بند پاکر واپس سمندر کی طرف لوٹے۔ بائبل میں لکھا ہے "خدا نے انہیں یہ رہبری نہ کی کہ وہ فلسطیوں کی راہ سے جاویں۔ اگرچہ وہ نزدیک کی راہ تھی۔ کیونکہ خدا نے کہا۔ ایسا نہو کہ وہ لڑائی دیکھ کے پچھتاویں اور مصر کو پھر جاویں۔ بلکہ خدا نے ان لوگوں کو دریائے قلزم کے بیابان کی طرف پھیرا" (خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ و ۱۸) اگر فرعون اوپر جاتا تو اسے اور بھی چکر کاٹ کر جھیلوں کے اوپر سے ہوکر جانا پڑتا۔ اور یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام اُسوقت تک بہت دور نکل چکے ہوتے۔ اور اسکی مملکت سے باہر چلے گئے ہوتے۔ اس لئے اس نے انکے پکڑنے کی ایک ہی صورت ممکن دیکھی کہ وہ سمندر کے خشک شدہ حصہ میں سے ان کا تعاقب کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسکی رتھوں کے بیلوں کو ڈرایا اور رتھوں کے راستہ میں مشکلات پیدا کر دیں جس کی وجہ سے اس کے سفر میں دیر ہوتی گئی۔ اور مدّ کا وقت آگیا۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر کے

لئے دیکھو خروج باب ۱۳ آیت ۱۷ سے آخر تک اور پھر باب ۱۴ (اس بیان میں بہت سی غلطیاں اور مبالغہ ہے مگر اجمالی طور پر اس سفر کا نقشہ اس سے معلوم ہو جاتا ہے)۔

جدید مؤرخین نے یہ بحث کی ہے کہ بنی اسرائیل کے گذر کا واقعہ صحیح ہے تو اس کا مقام کون سا ہے؟ بائیبل میں چونکہ ایک دریا کا بھی ذکر آتا ہے بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام جھیل تِمساح کے پاس سے گذرے ہیں جس کا پانی ان کے نزدیک گذشتہ زمانہ میں ایک نالہ کے ذریعہ سے سمندر سے ملتا تھا۔ (ڈوبائے آمی سٹیکل اور کُنڈیل کی بھی یہی رائے ہے (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا اکسوڈس (خروج) کالم ۱۴۲۸ و ۱۴۲۹۔ اس مقام کے لئے دیکھو اوپر کا نقشہ)۔

بعض کے نزدیک وہ بحیرہ قلزم کے پاس سے نہیں گذرے بلکہ زُوآن کے پاس سے ہوتے ہوئے (دیکھو اوپر کا نقشہ) بحیرۂ روم کے پاس سے گذرے ہیں۔ (بقول شلائیڈن اور برگش انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کالم ۱۴۳۸) بعض کے نزدیک وہ ان علاقوں میں سے کسی علاقہ میں سے بھی نہیں گذرے۔ بلکہ وہ شمالی افریقی مصر میں رہتے ہی نہ تھے بلکہ وہ اُس مصر میں رہتے تھے جو شمالی عرب میں واقع تھا اور ان کے نزدیک مُصر سے غلطی کھا کر بنی اسرائیل نے بائبل میں مصر لکھ دیا۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کالم ۱۴۳۶۔ جلد ۲) اس تھیوری کے مطابق اگر سمندر کے عبور کرنے کا واقعہ صحیح تسلیم کیا جائے تو بنی اسرائیل مغرب سے مشرق کو نہیں بلکہ مشرق سے مغرب کی طرف گئے تھے اور خلیج سویز نہیں بلکہ خلیج عقبہ کو سویز کے پاس سے نہیں بلکہ عقبہ کے پاس سے انہوں نے عبور کیا تھا۔ اگر عربی مصر کا بنی وقوع اس مقام پر سمجھا جائے تو پھر سمندر عبور کرنے کا واقعہ ان لوگوں کے نزدیک سراسر فرضی قرار پائے گا۔

آثار قدیمہ کی تحقیق اور پرانی تاریخوں سے یہ امر پوری طرح ثابت ہو چکا ہے کہ مصر نامی علاقہ بہ تغیر اشکال شمالی افریقہ۔ شمالی شام اور شمالی عرب میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ ان تین علاقوں کے علاوہ اور مقامات بھی مصر یا معران یا معرام یا مصرایم یا مُصری کہلاتے تھے۔ اور اسی وجہ سے بائبل کی بیان کردہ تفصیلات میں سے بعض کو شمالی افریقہ کے ملک مصر پر منطبق نہ دیکھتے ہوئے بائبل کے علوم کے جدید محققین میں سے بعض نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ افریقوی مصر نہیں بلکہ اگر یہ واقعات گذرے ہیں تو عربی مصر میں گذرے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے مدائن جانے کو وہ اس کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ مدائن شمالی عرب کے مصر کے ساتھ ملتا تھا۔

یہ امر کہ کئی علاقے مصر کہلاتے تھے مغربی مصنفوں کے لئے حیرت انگیز ہے لیکن عربی دانوں کے لئے نہیں۔ مصر کے معنے عربی زبان میں شہر کے ہیں۔ جن لوگوں کو کسی بڑے شہر کے پاس رہنے کا یا وہاں جانے کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ بڑے شہروں کے اردگرد کے علاقے بعض دفعہ بیسیوں میل تک اپنے علاقہ کے شہر کا نام لیکر نہیں بلاتے بلکہ صرف شہر کہتے ہیں۔ لاہور کے اردگرد کے دیہات میں جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص شہر گیا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ لاہور گیا ہے۔ انگریزی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں بھی سوکٹسنہ یعنی شہر کے لفظ سے انگلینڈ کے باشندے لنڈن مراد لیتے ہیں پس عرب لوگ اور عربی سے ملتی جلتی زبانیں بولنے والے اُس زمانہ میں کہ جب بڑے شہروں کا رواج کم تھا۔ اگر کسی بڑے بڑے قصبات پر مشتمل علاقہ کو مصر کہتے تھے۔ خواہ وہ شام میں خواہ عرب میں خواہ افریقہ میں۔ تو اسمیں تعجب کی کونسی بات ہے۔ مُصری یا معرام یا معران یا مصرایم سے انکی مراد صرف یہ ہوتی کہ وہ شہروں والا علاقہ ہے۔ عرب جیسی صحرا نورد قوم کے لئے شہروں میں بسنا ایک عجوبہ سے کم نہ تھا۔ اور جس علاقہ میں کثرت سے بڑے بڑے شہر اور قصبات ہوں وہ ان کے لئے ایسا حیرت انگیز امر تھا کہ اس علاقہ کا نام

[1] جدید مؤرخین میں بنی اسرائیل کے گزرنے کے مقام میں اختلاف

[1] آثار قدیمہ سے مصر نامی علاقہ کا شمالی افریقہ شمالی شام اور شمالی عرب میں پائے جانے کا ثبوت اور مصر کی مختلف معنوں کے لئے تعیین مقام عبور میں مشکل کا حل

بنی اسرائیل کے مصر کیطرف نہ جانے کے دلائل کا رد۔

شہری ملک رکھدینا ان کے لئے ایک طبعی امر تھا۔ پس صرف مصر کے لفظ سے بنی اسرائیل کے جلاوطنی کے واقعات کو افریقی مصر کے علاقہ سے بدلا نہیں جا سکتا۔ راستہ کی جزئیات میں مشکلات کیوجہ سے اس اصولی سوال کو نظر انداز کر دینا کہ بائبل اور قرآن کریم دونوں کے نزدیک اس مصر کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔ اور قرآن کریم کے اس بیان کی روشنی میں کہ اس مصر میں مُردوں کی لاشوں کو دیر تک قائم رکھنے کا رواج تھا۔ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی شخص کی شناخت کو اس لئے مشتبہ کر دیا جائے کہ گو اس کا حُلیہ اسکا نام اور اس کے باپ کا نام تو مذکورہ علامات کے مطابق ہے لیکن اس کے رومال کا رنگ وہ نہیں جو بتایا گیا تھا۔ پرانے زمانہ کے حالات اس طرح محفوظ نہیں کہ ہم اس زمانہ کے حالات کو سو فیصدی درست معلوم کر سکیں پس ہمیں ستر فیصدی اتفاق کو مشعلِ راہ سمجھتے ہوئے تیس فیصدی اختلاف کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ اور تیس فیصدی اختلاف پر ستر فیصدی اتفاق کو قربان کر دینے کی حماقت سے بچنا چاہیئے۔

بنی اسرائیل کے متعلق بعض لوگوں کا خیال کہ وہ مصر کیطرف نہیں گئے اور اس کے تین دلائل۔

بعض لوگ تاریخ کی منفی یا مثبت شہادت سے اس امر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسرائیل مصر کی طرف نہیں گئے۔ ان کے استدلال کی وجوہ یہ ہیں :-

(۱) مصری آثار قدیمہ میں بنی اسرائیل کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ (اسرائیل مصنفہ اڈولف لاڈز صـ۱۶)۔

(۲) منفتاح جس کے زمانہ میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے۔ اس کے زمانہ کے ایک پرانے اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حکومت کے پانچویں سال میں بنی اسرائیل کے کچھ قبائل کنعان میں بس رہے تھے۔ اور بائبل بتا رہی ہے۔ کہ بنی اسرائیل اس کے زمانہ میں وہاں سے نکلے اور کوئی ۴۰ سال میں جا کر کنعان میں داخل ہوئے۔ (۳) بیشک مصر میں بعض ایشیائی قبائل کے ورود کا پتہ ملتا ہے۔ لیکن ان واقعات کو اگر بنی اسرائیل پر چسپان کیا جائے تو کبھی واقعات ملتے جلتے ہیں مگر تاریخیں ٹھیک نہیں بیٹھتیں۔ اور کبھی تاریخیں ٹھیک بیٹھتی ہیں تو واقعات مطابقت نہیں کھاتے پس معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بناوٹی کہانی ہے۔

چونکہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے مصر میں جانے اور وہاں سے آنے کا ذکر کرتا ہے۔ ہم اس اعتراض کیطرف توجہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ (۱) یہ ضروری نہیں کہ ہر امر کا آثار قدیمہ سے حال معلوم ہو جائے۔ کیا اگر آج تہذیب کی ترقی کے زمانہ میں کسی متمدن ملک کی تاریخ کو مٹا دیا جائے تو کیا اسکی پوری تاریخ اس کے آثار سے معلوم ہو سکیگی۔ کیا مثلاً انگلستان یا یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ یا جرمنی یا فرانس کی مکمل تاریخ تمام قوموں کے اعداد و شمار۔ مذاہب اور ان کے فرقوں کا حال اور ان کے علوم و فنون کا پورا پتہ کسی ایک یا دو شہروں کے نشانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر موجودہ زمانہ کے صحیح حالات مکمل طور پر موجودہ زمانہ کے آثار سے بھی معلوم نہیں ہو سکتے تو اس سے زیادہ غیر معقول خیال کیا ہوگا کہ گذشتہ زمانہ کے تفصیلی حالات چند ہزار سال پہلے کے دو یا چار قصبات کے کھودنے سے معلوم ہو سکیں گے۔ یہ تو ایسی خلاف عقل بات ہے کہ اس پر کسی علم کی بنیاد رکھنی علم سے تمسخر کرنا ہے۔ مثبت شہادت تو خیر کچھ قیمت بھی رکھتی ہے۔ گو اسمیں بھی بہت سی غلطیوں کا امکان ہے۔ مگر یہ کہنا کہ چونکہ فلاں قوم کا ذکر نہیں ملا اس لئے وہ وہاں نہ تھی ایسا خلاف عقل خیال ہے کہ اسے علمی کتب میں پیش کرنے سے مصنفین کو خود ہی رکنا چاہیئے تھا۔ آخر بنی اسرائیل کی مصر میں حیثیت کیا تھی۔ غلاموں کی طرح وہ رہتے تھے۔ کوئی ایسے بڑے کام ان کے سپرد نہ تھے کہ ان کا ذکر تاریخی آثار میں آتا۔ انکی اہمیت کا باعث غالباً صرف یہ تھا کہ وہ ایک منفرد مذہب رکھتے تھے۔

اور یا یہ کہ غالباً ان کے زمانہ کے مصری بادشاہ خالص مصری قوم سے نہ تھے اور وہ بنی اسرائیل سے ڈرتے تھے کہ یہ کسی دوسری قوم سے مل کر ہماری حکومت کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ان حالات میں آثار قدیمہ میں ان کے نام آنے کی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ اور اگر نام آتا بھی تو آثار قدیمہ سے صرف تاریخی ٹکڑے معلوم ہو سکتے ہیں پوری تاریخ معلوم نہیں ہو سکتی کہ ان کی خاموشی کوئی دلیل سمجھی جائے۔

دوسری دلیل کہ کسی فرعونی اثر سے معلوم ہوتا ہے جو غالباً منفتاح فرعونِ مصر کا اثر ہے یا اس سے پہلے کے کسی بادشاہ کا کہ اس زمانہ میں بنی اسرائیل کنعان میں بستے تھے کوئی قابل توجہ جرح نہیں۔ کیونکہ اگر یہ اثر جس کی تاریخ معین نہیں حضرت یوسفؑ کے بعد کے زمانہ کا ہے اور خروج موسیٰؑ سے پہلے کا ہے۔ تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا کچھ حصہ خروج موسیٰؑ سے پہلے بھی کنعان کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اور اگر یہ اثر یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے پہلے کا ہے یا ہجرت موسوی کے بعد کا۔ تو اس سے کوئی خلاف نتیجہ نکلتا ہی نہیں۔

تیسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ بیشک بعض ایشیائی اقوام کا مصر میں ورود تاریخوں سے ملتا ہے۔ مگر انہیں بنی اسرائیل سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایک خالص منفی دلیل ہے۔ اور منفی دلیل ناقص آثار کی بناء پر کوئی بھی دلیل نہیں۔ ایک کتاب جس کے آدھے ورق پھٹے ہوئے ہوں۔ انکی بناء پر کیا کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ فلاں مضمون اس کتاب میں نہیں کیونکہ وہ ان ورقوں میں نہیں جو میرے پاس ہیں۔

ان تینوں قسم کی دلائل کو رد کرنے کے بعد میں بعض قیاسی دلائل اس امر کی تائید میں دیتا ہوں جو بنی اسرائیل کے مصر میں ورود کے ثبوت بین ہیں:-

(۱) یہی لوگ جو بنی اسرائیل کے مصر سے آنے کے خلاف ہیں تسلیم کرتے ہیں۔ کہ موسیٰ کا نام خود مصری زبان کا ہے۔ ان کے نزدیک مُوسیٰ مَوْسِے تھا۔ جس کے معنے 'بیٹا' کے ہیں۔ (مُوزِز اینڈ نا توحِیْدِ اِزم۔ مصنفہ سگمنڈ فرائیڈ صـ۱۳) اگر ان کا یہ دعویٰ درست ہے تو پھر یہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ اسرائیلی افریقی مصر میں تھے۔ اور وہاں انکی رہائش اِسقدر لمبی تھی۔ کہ انہوں نے مصری زبان کے نام بھی رکھنے شروع کر دئے تھے۔ یہ لوگ اس امر کا بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے بعض دوسرے ساتھیوں کے نام حور وغیرہ بھی جو بائبل میں آتے ہیں مصری ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو بنی اسرائیل کے مصر میں رہنے اور وہاں سے نکلنے کا یہ مزید ثبوت ہے۔

بنی اسرائیل کے مصر میں ورود کے چار قیاسی دلائل

(۲) بائبل مصر میں اپنے باپ دادوں کو بادشاہ اور حاکم قرار نہیں دیتی۔ کہ سمجھا جائے انہوں نے اپنی شان بڑھانے کے لئے یہ قصہ گھڑ لیا۔ بائبل تو ان کو وہاں غلاموں کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ اور اس قسم کے قصہ بنانے کا کوئی محرک نظر نہیں آتا۔ پس اسے بناوٹی قرار دینے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

(۳) بائبل میں جو تفصیلات ہیں وہ سب افریقوی مصر پر صادق آتی ہیں۔ فراعنہ کا ذکر ان کے بعض بادشاہوں کے نام جو تاریخ سے ثابت ہو گئے ہیں۔ افریقوی مصر کے بعض شہروں کا نام جو گم ہو چکے تھے مگر اب پرانی جگہوں کی کھدائیوں سے انکی تصدیق ہو گئی ہے۔ فرعونیوں کے قوانین اور آداب کے متعلق جو بائبل میں روشنی ڈالی گئی ہے سب تفصیلات آثار قدیمہ سے سچی ثابت ہو رہی ہیں۔ اسی طرح مثلاً یہ کہ انہوں نے غلہ کیلئے خاص گودام مقرر کر چھوڑے تھے۔ پرانے آثار سے ایسے کئی گوداموں کا پتہ چلا ہے۔ (ضمناً یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے مصریوں کے مذہب کے متعلق

بھی روشنی ڈالی ہے کہ وہ بادشاہ ہیں خدا کی صفات تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ امر بھی آثار قدیمہ سے ثابت ہو گیا ہے) اسی طرح مصر کے جغرافیہ کے متعلق بائبل کی معلومات بہت حد تک درست ہیں۔ پس یہ سب غالب طور پر درست تفصیلات جو بعض ایسے امور کے متعلق ہیں جو استداد زمانہ کی وجہ سے مخفی ہو گئے تھے۔ اور اب آثار قدیمہ سے ان کا پتہ چلا ہے یہ بتاتی ہیں کہ بنی اسرائیل کا گہرا تعلق اس زمانہ کے مصر کے ساتھ تھا اور جو شبہات اب پیدا کئے جاتے ہیں محض اس وجہ سے ہیں کہ کیوں سو فیصدی تطابق انہیں اتفاقًا سے نہیں جو نامکمل آثار قدیمہ سے یا نامکمل تاریخوں سے ان معترضین کو معلوم ہوئے ہیں۔ اور یہ مطالبہ خلاف عقل ہے۔

بنی اسرائیل کے سمندر سے گزرنے کے مقام کی تفصیل۔

(۴) قدیم یونانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے لوگ بھی اس امر کو تسلیم کرتے تھے کہ اسرائیلی وہاں سے نکل کر گئے ہیں گو وہ روایات بے سرو پا ہیں۔ مثلاً ان میں بتایا گیا ہے کہ اسرائیلی مصر کے کوڑھیوں کی اولاد ہیں۔ اور چونکہ انکو دوسروں سے الگ رکھا گیا۔ اور چونکہ وہ مصری خداؤں کا انکار کرنے لگے تھے۔ انہوں نے بغاوت کی اور اس لئے انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ یہ روایات علاوہ اور مصنفوں کے آبدیرا کے ہیکاٹیس نے جو سکندر رومی کا ہم عصر تھا۔ اور مینتھو نے جو باشندہ ہلیو پول کا تھا لکھی ہیں۔ (دیکھو اسرائیل مصنفہ اڈولف لاڈز صفحہ ۱۶۷) اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ روایات بائبل کی روایات کے کلی طور پر خلاف ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل مصر میں نہ گئے تھے اور نہ وہاں سے نکلے تھے تو پھر یہ روایات مصر والوں نے بنائیں کیوں؟ روایات میں جو اختلاف ہے اسکی وجہ تو سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ مصری اسرائیلیوں کے دشمن تھے۔ ان کا بادشاہ موسیٰؑ کے مقابلہ میں ذلیل ہو کر مرا۔ اس لئے انہوں نے یہ روایات گھڑ لیں کہ یہ کوڑھی تھے اور ہم نے انکو مار کر نکال دیا۔

جہاں سے بنی اسرائیل سمندر پار ہوئے وہاں کا فاصلہ صرف ¾ میل تھا۔

لیکن اس کی غرض کیا ہو سکتی تھی کہ نہ اسرائیلی ان کے ملک میں آئے نہ وہاں سے نکلے مگر مصری خود بخود قصے بنانے لگ گئے۔ کہ اسرائیلی ہمارے ملک میں آئے تھے اور ہم نے انکو نکال دیا۔ اور ادھر خود اسرائیلیوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا کہ ہم وہاں گئے تھے اور انہوں نے ہمیں نکال دیا۔ یہ بات بالکل خلاف عقل ہے اور بائبل اور قرآن کریم کا بیان کہ بنی اسرائیل مصر گئے تھے اور وہاں سے خدا تعالیٰ کی مدد سے نکلے بالکل درست ہے۔

اس امر کے واضح ہو جانے کے بعد کہ مصر سے مراد افریقی مصر ہی تھا یہ تو یقین ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل افریقی مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شمال کیطرف سے گئے یا وسط سے یا جنوب سے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر جہاں تک علوم تحقیق کا تعلق ہے اور بائبل اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی مد و جزر کی کیفیات سے نتیجہ نکلتا ہے یہی بات قرین قیاس ہے کہ بنو اسرائیل تل ابی سلیمان کے مقام سے (دیکھو نقشہ اس جگہ فرعون موسیٰ کا پایہ تخت ہوتا تھا) پہلے وسط یعنی جھیل تمساح کیطرف گئے جہاں سے کنعان نزدیک پڑتا ہے (دیکھو نقشہ) پھر وہاں سے جھیلوں کی روک دیکھ کر جنوب کیطرف لوٹے۔ اور سویز کے مقام کے پاس سمندر میں سے جزر کے وقت پار ہوئے اور وہاں سے قادس کیطرف روانہ ہو گئے۔

وَأَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ سے بنی اسرائیل نے سمندر کو پار کیا تھا وہ بہت چھوٹا علاقہ تھا۔ کیونکہ اگر وہ لمبا علاقہ ہوتا تو ایک طرف کھڑے ہوئے درمیان میں ہونے والے واقعہ کو دیکھ نہ سکتے اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خلیج سویز کے انتہائی شمالی حصہ کا پھیلاؤ کل ¾ میل ہے۔ اگر اس کے نصف میں فرعون کی غرقابی کا مقام تصور کیا جائے تو صرف چھ سات سو گز پر

لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ

راتوں کا وعدہ کیا پھر تم نے اس کے (پیچھے جانیکے) بعد ظلم سے کام لیتے ہوئے بچھڑے کو (معبود)

ظٰلِمُوْنَ ○ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ

بنا لیا۔ آیت ۵۲ پھر ہم نے اس کے بعد تمہیں معاف کیا

بنی اسرائیل کھڑے تھے اور انکی تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے معلوم ہوتا ہے فرعون اور اس کے کچھ ساتھی تیرنا نہ جانتے تھے۔ یا یہ کہ شام کا وقت تھا جلد ہی اندھیرا ہو گیا اور وہ راستہ بھول کر کھلے سمندر کی طرف بڑھنے لگ گئے اور اسمیں غرق ہو گئے۔ نپولین کے محولہ بالا واقعہ میں بھی اسی طرح ہوا تھا۔ شام کا وقت قریب تھا۔ جب وہ اور اس کے ساتھی سمندر کے خشک شدہ حصہ میں داخل ہوئے۔ ابھی پھر ہی رہے تھے کہ مد کا وقت آگیا۔ اور چونکہ خشکی کی طرف جھیلیں تھیں۔ سمندر کا پانی جھیلوں کے پانی سے مل گیا اور جہت کا اچھی طرح معلوم کرنا مشکل ہو گیا اور اس امر کا خوف پیدا ہو گیا کہ بجائے کنارے کی طرف جانے کے نپولین اور اس کے ہمراہی گہرے سمندر میں جا کر غرق ہو جائیں۔ اس پر نپولین نے اپنے ہمراہیوں کو ایک شکل پر چلنے کا حکم دیا۔ جس طرف کے آدمی پانی گہرا پاتے وہ اس طرف سمٹ آتے تھے جدھر کے لوگ پانی تھوڑا پاتے تھے۔ اور پھر نئی جگہ پر یہی شکل بنا لیتے تھے۔ اسی طرح کرتے کرتے آخر انہیں کنارہ مل گیا۔ نپولین ریت پر آکر لیٹ گیا۔ اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا کہ اگر آج میں غرق ہو جاتا تو ساری عیسائی دنیا شور مچا دیتی کہ یہ بھی ایک فرعون تھا جو سمندر میں غرق ہو گیا۔

حل لغات ۵۲ ظٰلِمُوْنَ: ظَلَمَ سے اسم فاعل ظَالِمٌ آتا ہے۔ ظٰلِمُوْنَ اسکی جمع ہے۔ ظَلَمَ کی تشریح کے لیے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا نمبر ۳۶۔

تفسیر۔ اس آیت میں ایک اور احسان کا ذکر ہے جس کی بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ناقدری کی۔ اور احسان کو عذاب میں بدلنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ واقعہ اس طرح ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایک پہاڑ پر جو اُن کے سفر کے راستہ میں تھا۔ کچھ دن الگ عبادت کریں اور خدا تعالیٰ کے خاص ارشادات سنیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس حکم کے ماتحت پہاڑ پر گئے۔ بنی اسرائیل نے کچھ دنوں کے بعد محسوس کیا کہ انہیں دیر ہو گئی ہے اور سمجھے کہ موسیٰؑ یا فوت ہو گئے ہیں یا کوئی اور ناگوار واقعہ ہوا ہے۔ اس پر انہوں نے ان زیورات سے جو انکے پاس تھے۔ ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور کہا یہ بچھڑا ان کا معبود ہے۔ اور اس کی پرستش میں لگ گئے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دی اور واپس جانے کا حکم دیا۔ بائبل میں اس واقعہ کا یوں ذکر آتا ہے:۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کی پرستش کا واقعہ

"اور اس نے موسیٰ سے کہا کہ خداوند پاس چڑھ آ۔ تو اور ہارون اور ندب اور ابیہو اور بنی اسرائیل کے بزرگوں سے ستر شخص تم دور سے سجدہ کرو۔ اور موسیٰ اکیلا خداوند کے نزدیک آوے پر وے نزدیک آویں اور لوگ اس کے ساتھ نہ چڑھیں۔" (خروج باب ۲۴ آیت ۱ و ۲) - پھر لکھا ہے۔ اس پر عمل کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بزرگوں سے کہا "تم ہمارے لئے یہاں جبتک کہ ہم تم پاس پھر آویں ٹھیرو۔ اور دیکھو کہ ہارون اور حور تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر کسی کو کچھ کام

ظَالِمُوْن ۱

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کا واقعہ بائبل میں

ہوئے تو وہ ان کے پاس جائے" (باب ۲۴ آیت ۱۴) پھر
لکھا ہے "اور موسیٰ بدلی کے درمیان چلا گیا اور پہاڑ پر
چڑھ گیا۔ اور موسیٰ پہاڑ پر چالیس دن رات رہا۔" (باب ۲۴
آیت ۱۸) پھر لکھا ہے۔ "جب لوگوں نے دیکھا موسیٰ پہاڑ
سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو وے ہارون کے پاس
جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اُٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ
ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے
ملک سے نکال لایا۔ ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون
نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جوروؤں
اور تمہارے بیٹوں کے اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں
ہیں توڑ توڑ کر مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے کے
زیور جو اُن کے کانوں میں تھے توڑ توڑ کر ہارون کے پاس
لائے۔ اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک

بنی اسرائیل کے بچھڑا بنانے کا ذکر قرآن مجید میں

بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے ہتھیار سے
درست کی۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ اے اسرائیل یہ تمہارا
معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور
جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربانگاہ
بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہہ کے منادی کی کہ کل خداوند کے
لئے عید ہے۔ اور وے صبح کو اُٹھے اور سوختنی قربانیاں
چڑھائیں اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں۔ اور لوگ
کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے" (خروج
باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶)۔

بچھڑے کے بنانے کے متعلق بائبل اور قرآن مجید کے بیان کا فرق۔

اوپر کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کے قول کے
مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر
کچھ دن بسر کرنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو
اپنے بعد ہارون اور حور کی اطاعت کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ کے
بعد بنی اسرائیل نے خیال کیا کہ شاید موسیٰ مر گئے ہیں کہ
واپس نہیں لوٹے۔ اور ہارون نے کہا کہ ہمارے لئے کچھ
بُت بناؤ۔ انہوں نے فوراً اس پر آمادگی ظاہر کی اور انہیں
اپنے زیورات لانے کو کہا جو وہ لے آئے۔ اور ان زیورات
سے ہارون نے ان کے لئے ایک بچھڑا بنایا۔ جس کے آگے
ہارون کی مدد اور اعانت سے ان لوگوں نے قربانیاں
گذرانیں۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:-
"اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور
پھر ان تیس راتوں کو دس راتیں اور بڑھا کر مکمل کر دیا اس
طرح اس کے رب کا وعدہ چالیس راتوں کی صورت میں
مکمل ہو گیا۔" (اعراف ع ۱۷۔ آیت ۱۴۳)
"اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے
ایک بچھڑا جو محض بیجان وجود تھا اور صرف اس میں کہ
آواز پیدا ہوتی تھی بنا لیا۔ اور اتنا بھی غور نہیں کیا کہ
وہ بولتا نہیں، ورنہ انہیں کوئی ہدایت کی بات بتاتا ہے
مگر بہرحال انہوں نے اسے اختیار کر لیا اور مشرک ہو گئے۔"
(اعراف ع ۱۸۔ آیت ۱۴۹)۔
"اور اس سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے)
پہلے ہارون نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اس بچھڑے
کے ذریعہ سے تمہارے ایمان کی آزمائش کی گئی ہے۔ اور
تمہارا رب تو رحمٰن ہے۔ (یعنی کلام ہدایت نازل کرتا ہے
حالانکہ یہ بچھڑا تو تم کو کوئی ہدایت نہیں دیتا) پس میری
فرمانبرداری کرو اور جو میں تم کو کہتا ہوں اس پر عمل کرو
(شرک نہ کرو) اس پر انہوں نے کہا کہ ہم تو جب تک موسیٰ
واپس نہ آ جائیں اس بچھڑے کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔"
(طٰہٰ ع ۵۔ آیت ۹۱-۹۲)
بائبل اور قرآن کریم کے اس بیان میں بہت بڑا فرق
ہے۔ اول تو قرآن کریم بنی اسرائیل کی گھبراہٹ کی وجہ
بھی بتاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کو ابتداءً پہاڑ پر تیس رات رہنے کا حکم دیا گیا تھا (لازماً
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے اسکا ذکر کر دیا
ہوگا) پھر خدا تعالیٰ نے اپنے احسان کو مکمل کرنے کے
لئے اس وعدہ کو چالیس رات تک بڑھا دیا (چالیس
کا عدد روحانی دنیا میں تکمیل کا عدد ہے) اس تدبیر سے

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

تاکہ تم شکر گذار بنو ۵۳ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب (یعنی تورات)

فرق کیوجہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دس دن کے وقفہ پڑنے پر گھبراہٹ پیدا ہونے لگ گئی ہوگی۔ کوئی خیال کرنے لگا ہوگا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں کوئی سمجھنے لگا ہوگا کہ شاید راستہ کی مشکلات کو دیکھ کر موسیٰ دھوکا دیکر ہمیں درمیان ہی میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں تب انہوں نے بوجہ ایمان میں حدیث العہد ہونے کے اپنے لئے اردگرد کی مشرک قوموں کیطرح بُت بنانیکی طرف توجہ کی۔ بائبل کے بیان سے اس گھبراہٹ کی وجہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

دوسرے قرآن کریم وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ شرک دوسرے اسرائیلیوں نے کیا۔ ہارون علیہ السلام اس الزام سے کُلی طور پر پاک تھے بلکہ انہوں نے اسرائیلیوں کو شرک سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ بائبل اسکے برخلاف ہارونؑ کو جو ایک نبی تھے شرک میں نہ صرف شریک بناتی ہے بلکہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسرائیلیوں کے کہنے پر بلا تردد انہوں نے بُت بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی اور نہ صرف بچھڑا بنایا بلکہ ساری قوم کو اسکی عبادت کی دعوت دی۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

بائبل کا یہ بیان ایسا خلاف عقل ہے کہ کوئی عقلمند ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا ایک نبی جو خدا تعالیٰ کا کلام سننے کا عادی تھا وہ ایک بے جان بے اثر بیفائدہ مورت بنا کر اُسے خدا قرار دیتا ہے اور خود بھی اسکی عبادت کرتا ہے اور دوسروں سے بھی اسکی عبادت کرواتا ہے۔ سوائے پادریوں اور یہودی احبار کے جو بائبل کی رطب و یابس تحریرات کو ماننے کیلئے عقل کے کانوں میں سیسہ ڈالے بیٹھے ہیں کون اس غیر معقول بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟

بعض لوگ اس واقعہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تیس دن کے وقفہ کے اندر بچھڑا کیونکر بن گیا؟ ان کے اس اعتراض سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے وہ بچھڑا دیکھا ہے اور اس کی صنعت انہیں ایسی اعلیٰ معلوم ہوئی ہے کہ اُسکے بنانے کیلئے بڑے بڑے کارخانوں اور کامل الصناعت انجنیروں کی ضرورت تھی۔ سونے کو پگھلا کر مٹی کے ایک سانچے میں ڈال کر اس سے ایک بھدا سا بُت بنا دینا کونسا بڑا کام ہے جس شخص نے وہ بُت بنایا تھا وہ دل سے مشرک تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح بنی اسرائیل میں پھر شرک جاری ہو جائے۔ پس اسنے گھنٹوں محنت کر کے ایک بھدا سا بُت بنا دیا تو اس میں کیا تعجب ہے؟ ایسے بُت کا بنانا سادہ کڑوں کے بنانے سے زیادہ مشکل نہیں جو چند گھنٹوں میں سُنار تیار کر لیتے ہیں باقی رہا یہ سوال کہ ہارونؑ کو یہ فن کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا جواب یہودی یا عیسائی دیں ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہارون علیہ السلام اس مشرکانہ فعل سے بَری تھے۔ اس کا بنانے والا ایک اور شخص سامری نام تھا ممکن ہے وہ خود سُنار ہو۔ یا ممکن ہے اس نے اپنے ہمخیال سُناروں کی مدد سے بچھڑا بنایا ہو۔

ے دس دن کا وقفہ، پھر وہ اس طرح بن گیا؟

ب بائبل کے بیان کے خلاف قرآن مجید کا حضرت ہارون کو شرک سے پاک قرار دینا۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کرنا پھر چالیس راتیں کر دینا کیا وعدہ خلافی نہیں؟ یہ ایسا ہی اعتراض ہے جیسے کسی کو تیس روپے دینے کا وعدہ کر کے چالیس دے جائیں تو اسے وعدہ خلافی کہا جائے۔ خدا کا کلام ایک نعمت ہے۔ تیس رات کلام کی جگہ چالیس رات کلام کر کے نعمت کو مکمل کیا گیا ہے۔ اور نعمت کی تکمیل وعدہ خلافی نہیں کہلاتی بلکہ انعام و احسان کہلاتی ہے۔

ج تیس راتوں کی بجائے چالیس راتوں کا وعدہ احسان تھا نہ کہ وعدہ خلافی۔

حل لغات ۵۳

ثُمَّ حرف عطف ہے۔ اردو زبان میں اسکا مفہوم ادا کرنے کے لئے "پھر" "تب"، "بعد ازاں" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مزید تشریح کیلئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۲۹

ثُمَّ

عَفَوْنَا

عَفَوْنَا : عَفَیٰ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ اور عَفیٰ عَنْہُ وَلَہٗ ذَنْبَہٗ وَعَنْ ذَنْبِہٖ (یَعْفُوْ) کے معنے ہیں صَفَحَ عَنْہُ وَ تَرَكَ عَقُوْبَتَہٗ وَھُوَ یَسْتَحِقُّھَا وَاَعْرَضَ عَنْ مُؤَاخَذَتِہٖ کہ اس کے قصور سے درگذر کیا اور اس کی سزا کو معاف کیا اور اس کی غلطی پر مؤاخذہ نہ کیا درآنحالیکہ وہ سزا کا مستحق تھا۔ جب عَفَی اللّٰہُ عَنْ فُلَانٍ کا فقرہ کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مَحٰی ذُنُوْبَہٗ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کو مٹا دیا۔ اور عَفٰی عَنِ الشَّیْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْہُ وَ تَنَزَّہَ عَنْ طَلَبِہٖ کسی چیز سے رُکا رہا اور اسکی طلب سے اپنے آپکو بچائے رکھا۔ (اقرب) پس عَفَوْنَا کے معنے ہوں گے کہ باوجود اس کے کہ تمہارا گناہ اس قابل تھا کہ ضرور سزا دیجاتی۔ لیکن پھر بھی ہم نے مواخذہ نہ کیا اور معاف کر دیا۔ (۲) ہم تم کو سزا دینے سے رُکے رہے۔

عَفَوْنَا عَنْکُمْ سے مراد قومی سزا کی معافی ہے نہ کہ تمام قوم کی۔

لَعَلَّ

لَعَلَّ : لَعَلَّ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا

تَشْکُرُوْنَ

تَشْکُرُوْنَ : شَکَرَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور شَکَرَ کبھی بغیر صلہ اور کبھی ل کے صلہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شَکَرَہٗ اور شَکَرَلَہٗ ہر دو طرح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اگر شَکَرَ کا صلہ لام آئے تو یہ زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ شَکَرَہٗ وَ شَکَرَ لَہٗ کے معنے ہیں اَثْنٰی عَلَیْہِ بِمَا اَوْلَاہُ مِنَ الْمَعْرُوْفِ کسی کے احسان کے باعث اس کی تعریف کی۔ گویا محسن کی تعریف کے ساتھ اقرارِ احسان شکر کہلاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ خروج باب ۳۲ آیت ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے بچھڑا بنایا تو اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر بھڑک اٹھا اور اس نے موسٰے سے کہا کہ "میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ ایک گردن کش قوم ہے اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کروں"۔ پھر آیت ۱۴ میں ہے۔ "اس پر حضرت موسٰے نے ان کے لئے دعا کی اور مطابق توریت تب خدا وند نے اس بدی سے، جو چاہا تھا، کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا"۔ یعنی انہیں سزا نہ دی بلکہ درگذر فرمایا۔

اسجگہ عَفَوْنَا عَنْکُمْ سے مراد قومی سزا کی معافی ہے نہ کہ تمام قوم کی معافی۔ قومی جرائم کی دو شقیں ہوتی ہیں۔ ایک شق اس کی تمام قوم سے بحیثیت مجموعی تعلق رکھتی ہے۔ اور ایک شق اس کے افراد سے تعلق رکھتی ہے۔ قومی جرائم میں کچھ اشخاص شرارت میں زیادہ حصہ لینے والے ہوتے ہیں۔ کچھ کم حصہ لینے والے ہوتے ہیں کچھ لوگ حصہ تو نہیں لیتے مگر دل میں ساتھ ہوتے ہیں اور زبان سے بھی ساتھ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ زبان سے تو ساتھ نہیں دیتے مگر دل سے ساتھ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں بھی شامل ہو جاتے ہیں مگر دل میں مخالف ہوتے ہیں۔ صرف بزدلی کی وجہ سے اشتراک کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عمل میں شریک نہیں ہوتے صرف زبان سے تائید کر دیتے ہیں مگر دل سے اُس بدی کے مخالف ہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نہ عمل سے شامل ہوتے ہیں نہ زبان کے شامل ہوتے ہیں نہ دل سے شامل ہوتے ہیں لیکن وہ مقابلہ بھی نہیں کرتے خاموش ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بدی کے خلاف اظہار ناراضگی بھی کر دیتے ہیں لیکن پوری کوشش اس کو روکنے کیلئے نہیں کرتے قومی سزا میں یہ سارے کے سارے شریک ہو جاتے ہیں لیکن جو سزا شخصی ہوتی ہے۔ اس میں ہر ایک کے سلوک میں فرق کیا جاتا ہے۔ اسجگہ عَفَوْنَا عَنْکُمْ سے مراد قومی سزا ہی ہے۔ یعنی اس جرم کی بنی اسرائیل کو بحیثیت قوم جو سزا ملتی تھی۔ حضرت موسٰے علیہ السلام کی دعا سے وہ روک دی گئی۔ افراد کے شخصی جرم جن کا ذکر یہاں نہیں۔ جیسا کہ ایک آیت چھوڑ کر بعد کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی طور پر جو لوگ بڑے مجرم تھے انکو سزا دیجی گئی۔

وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى

اور فرقان دیئے تاکہ تم ہدایت پاؤ ۵۴ اور (اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب موسیٰ نے

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ - یعنی یہ فضل ہم نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم ہماری رحمت کے قدردان بنجاؤ اور تمہیں معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کیسا رحیم ہے۔ اور اس کی رحمت کی وسعت کو دیکھکر تم بار بار اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو ÷

حل لغات ۵۴ اَلْفُرْقَانَ : فُرْقَان دراصل فَرَقَ کا مصدر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں فَرَقَ بَيْنَهُمَا فُرْقَانًا اَيْ فَصَلَ اَبْعَاضَهُمَا یعنی دو چیزوں کے حصوں کو جدا جدا کر دیا اور جب فَرَقَ لِفُلَانٍ اَمْرٌ اَوْ رَاْيٌ کہیں تو اسکا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ بَيَّنَ وَاتَّضَحَ فلاں کے لئے اس کی رائے اور معاملہ کی حقیقت واضح اور اچھی طرح ظاہر ہوگئی۔ نیز کہتے ہیں فَرَقَ لَهٗ عَنِ الشَّيْءِ اور مراد یہ ہوتی ہے۔ کہ بَيَّنَهٗ اس کے سامنے کسی بات کو اچھی طرح بیان کر دیا۔ علاوہ ازیں اَلْفُرْقَانُ کے معنے ہیں اَلْقُرْاٰنُ قرآن مجید۔ كُلُّ مَا فُرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ ہر وہ بات جس سے حق اور باطل کے درمیان تمیز ہوجائے۔ اَلنَّصْرُ مدد۔ اَلْبُرْهَانُ۔ دلیل۔ اَلصُّبْحُ اَوِ السَّحَرُ صبح یا سحری کا وقت۔ اِنْفِرَاقُ الْبَحْرِ سمندر کا دو ٹکڑے ہونا۔ اَلتَّوْرٰىةُ تورات کو بھی فرقان کہتے ہیں۔ نیز بدر کی جنگ کو بھی يَوْمُ الْفُرْقَانِ کے نام سے موسوم کرتے ہیں (اقرب) فُرْقَان کے اصل معنے تو كُلُّ مَا فُرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ کے ہیں۔ لیکن لغت والوں نے اس لفظ کے ذیل میں قرآن مجید۔ تورات اور سمندر کے دو ٹکڑے ہونے کے بھی معنے کئے ہیں۔ یہ استنباطی معنے ہیں نہ کہ لغوی۔ کیونکہ مذکورہ اشیاء کے ذریعہ سے مختلف مذاہب

لعلکم تشکرون کی تشریح۔

والوں کے نزدیک حق و باطل میں تمیز ہوگئی۔ اس لئے انکو فرقان کہا گیا۔

تہتدون۔

تَهْتَدُوْنَ : اِهْتَدٰى سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور اِهْتَدٰى هَدٰى سے باب افتعال ہے۔ هَدٰى کے لئے دیکھو سورہ فاتحہ ۶ نیز سورہ بقرہ ۳۔ اِهْتَدٰى کے ایک معنے سب سے آگے ہوجانے کے بھی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں اِهْتَدَى الْفَرَسُ الْخَيْلَ صَارَ فِيْ اَوَائِلِهَا کہ فلاں گھوڑا باقی قافلہ کے گھوڑوں کے آگے آگے چلا (اقرب) پس تَهْتَدُوْنَ کے معنے ہدایت پانے کے علاوہ یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ تا تم سب لوگوں سے آگے نکل جاؤ۔ ان کے پیش رو ہو جاؤ۔

الفرقان

تفسیر۔ اس آیت میں ضمنی طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان چالیس راتوں میں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ کیا کچھ دیا گیا تھا اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہم تو بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے اتنا کام کر رہے تھے اور ان کی ترقی کے سامان پیدا کر رہے تھے۔ اور یہ لوگ ایک زندہ خدا اور محسن خدا کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی پرستش میں مشغول تھے۔ یہ تقابل اللہ تعالیٰ کے فعل کا اور بنی اسرائیل کے فعل کا بنی اسرائیل کے جرم کو ایسا واضح کر دیتا ہے کہ کوئی عقلمند اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم تمہاری ہدایت کے سامان کر رہے تھے اور تم اپنی گمراہی کے سامان کر رہے تھے۔ کتاب اور فرقان اُس پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے۔ انکی غرض تو یہ تھی کہ وہ اجمالی ایمان جو بنی اسرائیل کو حاصل تھا اسے تفصیلی ایمان سے بدل دیا جائے۔

آیت واذ اٰتینا الخ میں اللہ تعالیٰ کے فعل اور بنی اسرائیل کے فعل کے تقابل کی طرف اشارہ۔

مگر بنی اسرائیل نے ان ایام میں اس اجمالی ایمان کو بھی کھو دیا۔ اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اس جگہ بعض امور بیان کر دینے ضروری ہیں۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے سلسلہ نبوت کی پہلی کڑی تھے جس کی آخری کڑی کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوئے۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرعون کے ساتھیوں نے کہا اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَہٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ (ع۱۵) اے فرعون! کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ ملک میں فساد کریں۔ اسی طرح ایک درجن سے بھی زیادہ مواقع پر قرآن کریم میں بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم قرار دیا گیا ہے۔ گو اس کی یہ تاویل بھی ہوسکتی ہے کہ قوم سے ان کے ماننے والے لوگ مراد لئے جائیں لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

حضرت موسیٰ کے بنی اسرائیل میں سے ہونیکا ثبوت قرآن کریم سے۔

پس آپکو ماننے والے بھی سوائے شاذو نادر کے بنی اسرائیل ہی ہونگے۔ پس قوم سے مراد اس صورت میں بھی بنی اسرائیل ہی بنتے ہیں۔ مگر ایک آیت قرآن کریم میں ایسی ہے جو قوم کے لفظ کو بالکل واضح کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ (یونس ع۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام پر انکی قوم میں سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے تھے۔ اس جگہ قوم سے مراد بہرحال بنی اسرائیل ہی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ فرمایا کہ انکی قوم کے تھوڑے آدمی آپ پر ایمان لائے تھے۔ تو قوم سے مراد مومن نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قوم سے مراد نسلی قوم ہی لیجا سکتی ہے۔

نئے محققین کی اس بات کو ثابت کرنیکی بیہودہ دلیلیں کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے۔

آجکل کے نئے محقق اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے۔ بلکہ وہ کسی مصری قوم میں سے تھے۔ اور وہ اس کے مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں :-

اوّل موسیٰ کا نام مصری زبان کا ہے۔ چنانچہ مصری زبان میں "موسے" بچے کو کہتے ہیں۔ بریسٹڈ اپنی کتاب "ڈان آف کانشنس" میں لکھتا ہے کہ مصریوں میں "آمن موسے" اور "پتا موسے" قسم کے نام پائے جاتے ہیں جن کے معنے ہیں۔ امون (ایک مصری دیوتا) کا بچہ۔ پتا (ایک مصری دیوتا) کا بچہ۔

پروفیسر سگمنڈ فرائیڈ اپنی کتاب "موزز اینڈ مانوتھی ازم" Moses and Monotheism - میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے علاوہ مصری بادشاہوں کے نام بھی اس رنگ کے پائے جاتے ہیں۔ جیسے "آہ موسے" "تھتمُٹ موسے" "راموسے" وغیرہ۔ یہ "راموسے" وہی ہے جس کے نام کو بائیبل میں "رعمسیس" لکھا گیا ہے۔ را سورج کا دیوتا تھا۔ پس "راموسے" کے معنے ہوئے۔ سورج دیوتا کا دیا ہوا بیٹا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "موسے" کے ساتھ جو نام تھا وہ گر گیا اور "موسیٰ" خالی موسیٰ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

دوسری دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ توحید کنعانی قبائل میں نہیں پائی جاتی۔ توحید کا عقیدہ ایک مصر کے بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس بادشاہ کا نام "امون ہوتپ چہارم" بتایا جاتا ہے۔ اس بادشاہ نے ایک خدا کی جس کا نام وہ "اتون" بتاتا تھا پرستش کی اور لوگوں سے کروائی۔ اتون کا لفظ پرانی کتب میں سورج دیوتا کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہیلیو پولس کے مقام پر سورج دیوتا کا ایک بڑا مندر تھا جس میں سورج کی پوجا کیجاتی تھی اس مندر کے ساتھ تعلق رکھنے والے بہت سے پجاری

فلسفیانہ خیالات کے ہوتے ہیں۔ انہوں نے آہستہ آہستہ مومن
دیوتا کو ایک بڑی دیوتا سے اخلاقی دیوتا کی شکل میں بدلنا شروع
کر دیا۔ اسی تصور کو "عمون ہوتپ" نے واحد خدا کے تصور کا
جامہ پہنایا اور مصر میں اس کو رائج کیا۔ اس کا ایک فقرہ نقل کیا جاتا
ہے جسے بریسٹڈ نے اپنی تاریخ مصر (HISTORY OF EGYPT) میں درج کیا ہے اور وہ یہ ہے "اے
یگانہ و تنہا خدا جس کے سوا اور کوئی نہیں" اس سے استدلال کیا گیا ہے
کہ توحید کے خیال کا بانی وہی تھا اور اس نے ملک میں جبراً اس
خیال کی اشاعت کی۔ اس بادشاہ نے بت خانے بھی تڑوائے۔ چونکہ
"عمون ہوتپ" مشرکانہ نام تھا اس لئے اس بادشاہ نے اپنا نام
بھی "اخناتون" رکھا گویا اپنے آپ کو "اتون" یعنی واحد خدا
کی طرف منسوب کیا۔

تیسری دلیل ان لوگوں کی یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل
میں ختنہ رائج کیا اور ختنہ کا دستور مصری ہے۔ پس معلوم ہوا کہ موسیٰ
مصری تھے۔

چوتھی دلیل یہ دی گئی ہے کہ اس اخناتون بادشاہ یا عمون
ہوتپ بادشاہ کی تعلیم میں کہیں بعث بعد الموت کا ذکر نہیں کیا گیا
ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں کہیں بعث بعد الموت کا
ذکر نہیں۔

پانچویں دلیل یہ دی گئی ہے کہ مصری سور سے نفرت کرتے
تھے ایسا ہی موسوی تعلیم میں سور سے نفرت دلائی گئی ہے۔

چھٹی دلیل یہ دی گئی ہے کہ موسیٰ کی نسبت آتا ہے کہ وہ اچھی
طرح اپنے خیالات ظاہر نہ کر سکتے تھے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے
کہ وہ مصری تھے اور عبرانی زبان اچھی طرح نہ بول سکتے تھے۔

پس معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے اور ان
لوگوں کے خیال میں وہ عمون ہوتپ المعروف بہ اخناتون بادشاہ
کے متبعین میں سے تھے۔ اخناتون کے بعد پھر دوبارہ مصری
مذہب قائم ہوگیا اور شرک نے جگہ لے لی جب ان میں اخناتون کی
موحدانہ تعلیم کے پھیلنے کا کوئی امکان نہ رہا تو حضرت موسیٰ علیہ
السلام نے ایک غیر قوم یعنی بنی اسرائیل کی طرف توجہ کی جو مصریوں
کے ظلم کا تختہ مشق بنی ہوئی تھی اور عام مصری خیالات کو اپنا متنافر
کی وجہ سے چھوڑنے پر آمادہ کی جا سکتی تھی۔ اسرائیلیوں نے اس
وجہ سے کہ وہ موسیٰ مصری کے خیالات کو مانکر مصری قوم کے خیالات
کی تردید کرنے والے ہو جاتے تھے جو ان کی دشمن تھی جلدی سے اس
دین کو قبول کر لیا اور جب اس دین کو قبول کرنے کی وجہ سے مصر
میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ
انہوں نے اس ملک سے ہجرت کی اور کنعان کی طرف آ گئے۔

اب میں ان چھ دلیلوں کا جو پیش کی جاتی ہیں مختصراً
جواب دیتا ہوں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کسی مصری قوم میں سے ثابت کرنے کے دلائل کا رد

پہلی دلیل یہ دی گئی ہے کہ موسیٰ کا نام مصری ہے اس لئے
حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری ہیں۔ یہ دلیل نہایت ہی مضحکہ خیز
ہے بنی اسرائیل مصر میں بستے تھے اور ادنیٰ حیثیت میں رہتے
تھے اس لئے لازمی طور پر انہیں مصری تہذیب اور مصری اقوام
کے اثر سے متأثر ہونا چاہئے تھا۔ ہم ہندوستان میں دیکھتے
ہیں کہ تھوڑے سے انگریز ہیں۔ ہزار میں سے ایک بھی انگریز
آبادی کے لحاظ سے نہیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں
ہزاروں آدمی جیمز (JAMES) جونز (JONES) اور ٹامس (THAMAS)
وغیرہ ناموں سے اپنے خیال میں اپنی عزت افزائی کر رہے ہیں
ان کے رنگ کوئلوں کی طرح کالے ہیں نسلاً وہ چوہڑوں چماروں
میں سے ہیں۔ زبان انگریزی جاننا تو الگ رہا بعض ان میں سے
ایسے ہیں کہ لفظ عیسائی یا انگریز بھی نہیں بول سکتے۔ عیسائی کو
"ہسائی" کہتے اور انگریز کو "گریج" کہتے ہیں مگر پھر بھی ٹامس
جونز اور اس قسم کے اور نام انہوں نے رکھے ہوئے ہوتے ہیں
کیا ان ناموں کو دیکھ کر کوئی مؤرخ یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب
سمجھا جائے گا کہ وہ انگریزی نسل کے آدمی ہیں۔ آخر انسانی
استدلال کی کوئی نہ کوئی قیمت چاہیئے۔ ایک مؤرخ کو رائے قائم
کرنے سے پہلے ہر قسم کے حالات کو سوچ کر رائے قائم کرنی چاہیئے
میں حیران ہوں یہ یورپین مؤرخ آخر کس بنا پر ایسی جلدی نتائج
نکالنے کی طرف مائل ہو گئے ہیں وہ موسیٰ اور ان کے چند ساتھیوں

کے ناموں پر حیران ہیں وہ ہندوستان میں آئیں ہم ان کو ہزاروں کالے کلوٹے نسلاً چوہڑے اور چمار زبان انگریزی سے نابلد ٹامس (THAMAS) جیمز اور جونز دکھا دیتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا حال ہے سینکڑوں عورتیں ایسی ہیں جو عیسائی تو نہیں لیکن کسی کانونٹ (CONVENT) میں پڑھنے کی وجہ سے انہوں نے اپنے نام یا اپنے بچوں کے نام انگریزی طرز پر رکھ لئے ہیں اور بعض جگہ پر ایک ایک انگریزی نام ہے اور ایک ایک اسلامی یا ہندوانہ نام اور وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں میں اسی انگریزی نام سے مشہور ہوتی ہیں کوئی ثریا ہے اور وہ اپنی ہمجولیوں میں ڈالی (DOLLY) کہلاتی ہے کوئی رام کول ہے اور وہ اپنی سہیلیوں میں جین (JANE) کہلاتی ہے کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں کہ وہ انگریز ہیں پھر ان سینکڑوں اور ہزاروں مثالوں کو دیکھ کر کیوں نہ یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اگر موسیٰ ایک مصری نام ہی ہے تو موسیٰ علیہ السلام کے والدین نے یا جس نے بھی یہ نام رکھا اس نے مصری اثر کے نیچے اس بچے کو ایک مصری نام دے دیا اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل اور قرآن کریم کے رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی پیدائش پر فرعون کی سختی سے بچانے کے لئے ان کی والدہ نے خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک ٹوکرے میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا تھا اور اُن کو مصری شاہی خاندان کی ایک عورت نے وہاں سے اٹھایا اور پالا تو اس میں کونسے تعجب کی بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا نام مصری تھا۔ آخر جو بچہ دریا کے کنارے پڑا ہوا پایا گیا اس کا نام کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا اگر اسے اٹھانے والوں نے اس کا نام اپنی زبان میں رکھا تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے پس فرض کرو یہ مصری نام ہے تو بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے واقعات میں ایک ایسی کڑی موجود ہے جو ان کے نام کے مصری ہونے کے امکان کو ثابت کرتی ہے تو پھر اس نام سے انکی مصری قومیت کا نتیجہ نکالنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ غرض مصری نام کی وجہ سے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام مصری زبان میں ہونا ان کے مصری قوم میں سے ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری ہونے کا استدلال نہایت ہی کمزور ہے اور اس استدلال سے زیادہ بودا اور کمزور استدلال کم ہی ہو سکتا ہے بائبل کا بیان اس واقعہ کے متعلق مندرجہ ذیل ہے۔

"بنو لاوی میں سے ایک مرد نے اپنے قبیلہ کی عورت سے شادی کی" وہ عورت حاملہ ہوئی اور بیٹا جنی اور اس نے اسے خوبصورت دیکھ کر تین مہینے تک چھپا رکھا اور جب آگے کو چھپا نہ سکی تو اس نے سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا بنایا اور اس پر لاسا اور رال لگایا اور لڑکے کو اس میں رکھا اور اس نے اسے دریا کے کنارے جھاؤ میں رکھ دیا اور اسکی بہن دور سے کھڑی دیکھتی تھی کہ کیا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ تب فرعون کی بیٹی غسل کرنے کو دریا پر اتری اور اسکی سہیلیاں دریا کے کنارے پر پھرنے لگیں اس نے جھاؤ میں ٹوکرا دیکھ کر اپنی سہیلی کو بھیجا کہ اسے اٹھا لے۔ جب اس نے اسے کھولا تو لڑکے کو دیکھا۔ اور دیکھو وہ روتا ہے اسے اس پر رحم آیا اور بولی یہ کسی عبرانی کا لڑکا ہے تب اس (یعنی موسیٰ) کی بہن نے فرعون کی بیٹی کو کہا کہئے تو میں جا کے عبرانی عورتوں میں سے ایک دائی تجھ پاس لے آؤں تاکہ وہ تیرے لئے اس لڑکے کو دودھ پلائے۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ جا وہ چھوکری گئی اور لڑکے کی ماں کو بلایا۔ فرعون کی بیٹی نے اسے کہا کہ اس لڑکے کو لے اور میرے لئے دودھ پلا۔ میں تجھے درماہہ دونگی۔ اس عورت نے لڑکے کو لیا اور دودھ پلایا۔ جب لڑکا بڑھا وہ اسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اس کا بیٹا ٹھہرا۔ اس نے اس کا نام موسیٰ رکھا اور کہا اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا۔" (خروج باب ۲ آیت ۲ تا ۱۰)

قرآن کریم میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح فرمایا گیا ہے۔ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ۗ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۞ وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّىْ وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖ

عَسٰۤی اَنۡ یَّنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَتَّخِذَہٗ وَلَدًا وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۝ (قصص ع۱) یعنی موسیٰ کی پیدائش پر ہم نے موسیٰ کی والدہ کو وحی کی کہ اس کو دودھ پلا۔ پھر جب تجھے ڈر ہو کہ بچے کی پیدائش کا راز فاش ہو جائے گا تو تُو اس کو دریا میں ڈال دیجئو اور ڈریو نہیں اور نہ ہی غم کیجئو (سورۂ طٰہٰ ع۲ میں دریا میں ڈالنے کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو یہ کہا گیا تھا کہ انہیں ایک صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈالا جائے) ہم اس کو تیری طرف واپس لائیں گے اور اس کو اپنا رسول بنائیں گے۔ پھر اُس کو آلِ فرعون نے دریا کے پاس سے اُٹھا لیا تاکہ وہ اُن کا دشمن ہو اور غم کا موجب ہو۔ فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر یقیناً خطا کار تھے اور فرعون کے خاندان کی ایک عورت نے فرعون سے کہا یہ میرے لئے اور تیرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا اِس کو مارو نہیں ممکن ہے یہ ہمیں نفع دے (اچھا غلام ثابت ہو) یا (اگر بہت ذہین نکلے) تو ہم اسے بیٹا بنالیں اور وہ حقیقت کو جانتے نہیں تھے۔ ان حوالوں سے ثابت ہے کہ قرآن کریم اور بائبل کے رو سے فرعون کے گھر کی ایک عورت نے جو بائبل کے بیان کے مطابق فرعون کی بیٹی تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا اور پالا۔ اور بائبل صاف کہتی ہے کہ اس فرعون کی بیٹی نے ہی موسیٰ علیہ السلام کا نام رکھا تھا اور اگر ایسا ہوا ہو تو فرعون کی بیٹی نے آخر اپنا مصری نام ہی رکھا ہوگا۔ پس مصری نام کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری قرار دینا بالکل خلافِ عقل ہے۔ پنجاب میں اس قسم کی کم از کم دو مثالیں پائی جاتی ہیں دو مشہور انگریزوں نے دو ہندوستانی لڑکے پالے اور ان کے انگریزی نام رکھے اور وہ لڑکے انہی انگریزی ناموں سے اب تک مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک وار برٹن خاندان کی طرف منسوب ہے اور دوسرا ہندوستانی نوجوان ڈاکٹر مارٹن کے خاندان کی طرف منسوب تھا جس خاندان کا ایک فرد ابی سینیا میں وزیر کے عہدہ پر بھی متمکن رہا ہے۔ وہ افراد جن کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں خالص ہندوستانی الاصل ہیں مگر چونکہ انگریزوں نے ان کو پالا تھا اور انگریزوں نے ہی اُن کا اپنی طرز پر نام رکھا اس لئے وہ انگریزی ناموں سے ہی مشہور ہیں۔

علاوہ ازیں میرے نزدیک اس امر کا بھی کوئی کافی ثبوت پیش نہیں کیا گیا کہ موسیٰ دراصل میں مصری نام ہے اور نہ اس امر کا کوئی کافی ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ موسیٰ عبرانی نام نہیں ہے جو لوگ موسیٰ کو مصری نام قرار دیتے ہیں وہ بعض مصری ناموں سے استدلال کرتے ہیں کہ اُن کا ایک حصہ موسیٰ کے نام پر مشتمل ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ محققینِ زبان کا اِس میں اختلاف ہے بلکہ ایک بھی محقق ایسا نہیں جو اس لفظ کا تلفظ جیسے موسیٰ قرار دیا گیا ہے موسیٰ بتاتا ہو بلکہ کوئی اسے "مَوْسِےْ" پڑھتا ہے اور کوئی اسے "مِیس" اور کوئی "میسو" بتاتا ہے جس کے معنے بچے کے ہیں اور یہ نام کبھی اکیلا ہوتا ہے اور کبھی کسی اور نام کے ساتھ ملا کر استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ مصری شاہی خاندان کے مندرجہ ذیل ناموں کا یہ حصہ ہے۔

تھاٹ میس	(THOTMS)
آہ میس	(AHEMS)
رامیسو	(RAMESSU)

اب یہ ظاہر ہے کہ موسیٰ کے تلفظ اور اس تلفظ میں بہت بڑا فرق ہے۔ اوّل موسیٰ میں حروفِ علت میں سے واؤ استعمال ہوئی ہے اور "میسو" یا "میس" میں یا استعمال ہوئی ہے دوسرے موسیٰ میں حرفِ علت کی آواز لمبی ہے لیکن "میس" یا "میسو" میں وہ اتنی چھوٹی ہے کہ حرفِ علت کی بجائے اسے خالی حرکت کہنا زیادہ درست ہوگا۔ پھر موسیٰ کے آخر میں الف آتا ہے اور "میسو" کے آخر میں واؤ آتی ہے اور "میس" کے آخر میں کچھ بھی نہیں آتا۔ چوتھے یہ کہ بائبل میں لکھا ہے فرعون کی بیٹی نے موسیٰ نام سے بچے کو پکارتے ہوئے کہا کیونکہ ہم نے اسے پانی سے بچایا ہے لیکن مصری زبان میں پانی سے نکالنے کے معنوں میں موسیٰ یا اس کے مشابہ کوئی لفظ نہیں پایا جاتا۔ ہاں عبرانی زبان میں اس سے ملتے جلتے معنے ہو سکتے ہیں چنانچہ عبرانی زبان میں موسیٰ کا نام "مُوشِےْ" آتا ہے اور اگر موشے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ایک حصہ "مُو" بنے گا جس کے

معنے پانی کے ہونگے اور دوسرا حصہ "شے" بنے گا جس کے معنے چیز کے ہونگے عربی اور عبرانی زبانیں آپس میں ملتی جلتی ہیں۔ عربی میں پانی کے لئے مَاء کا لفظ ہے اور چیز کے لئے شَیْءٌ کا۔ اگر عربی میں یہ نام رکھا جاتا تو یہ "مَاء شَیْءٌ" بنے گا بگڑی ہوئی عربی میں بھی پانی کے لئے "مُو" کا لفظ بولتے ہیں چنانچہ جو لوگ حج کے لئے گئے ہیں انہوں نے یہ الفاظ سُنے ہونگے کہ ایک شخص دوسرے سے سوال کرتا ہے مَوْشَے فِیْہِ جس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ کیا اس میں کچھ پانی ہے صحیح عربی میں تو یہ فقرہ یوں بنتا ہے هَلْ شَیْءٌ مِنَ الْمَاءِ فِیْهِ لیکن جاہل لوگ مختصر کر کے اسے "مَوْ شَے فِیْهِ" کہہ دیتے ہیں مَاء کی جگہ مَوْ کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں اور شَیْءٌ کی جگہ "شَے" کا۔ عبرانی زبان بھی درحقیقت عربی کی ایک بگڑی ہوئی قسم ہے پس اس زبان کے لحاظ سے "مَوْشے" کے معنے ہوئے پانی کی چیز۔ اور مطلب یہ ہوا کہ پانی میں سے نکالا ہوا بچہ عربی میں آکر اسے موسیٰ بنا دیا گیا جیسے یشوع کا عربی تلفظ عیسیٰ ہے اور جیسے "یشمعیل" کا عربی تلفظ اسماعیل ہے۔ پس نہایت قوی قرینہ اس بات کا موجود ہے کہ موسیٰ کا نام عبرانی ہی ہے اور بائبل کا بیان اس بارہ میں کمزور ہے۔ یہ خیال کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں کہ کئی سال تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پاس رہے اور ان کا کوئی نام ہی نہیں تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے خاندان سے انکی والدہ دودھ پلانے کے لئے لائیں تو انہوں نے اس خیال سے کہ یہ پانی سے بچا ہے اس کا نام "مَوْشے" رکھا کہ پانی کی چیز۔ جس نام کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا وہ معجزہ ہمیشہ ان کے سامنے تازہ رہتا تھا معلوم ہوتا ہے جب وہ اس بچے کو واپس لے کر فرعون کے گھر گئی ہیں تو وہاں انہوں نے یہ نام لیا ہے اور اسکی وجہ بتائی۔ تو یہ نام فرعون کے گھر والوں کو بھی پسند آگیا اور انہوں نے کہا ہم اس نام سے اسے بلایا کرینگے یہ حقیقت کے قریب ترین تشریح ہے۔ کیونکہ اوّل مصری زبان میں "موشے" کی طرز کا کوئی مصری لفظ نہیں جس کے معنی پانی سے بچانے کے ہوں۔

دوسرے یہ خیال کرنا بعید از قیاس ہے کہ سالہا سال ایک بچہ کا کوئی نام ہی نہ رکھا گیا ہو۔ اگر ہم عربی زبان پر غور کریں تو اس رستہ سے بھی موسیٰ کے نام کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ عربی زبان کے رو سے موسیٰ کے معنے کٹے ہوئے کے ہونگے اور اس نام کے یہ معنے ہوسکتے ہیں کہ گویا وہ اپنے خاندان سے کٹ کر فرعونیوں میں پالا گیا۔ اگر عبرانی تلفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے جو "موشے" ہے دیکھا جائے تو "موشی" کے معنے عربی زبان میں نکالے ہوئے کے ہیں چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اَوْشَی الشَّیْءَ اِسْتَخْرَجَهٗ۔ وَشْی کا اسم فاعل بنے گا مُوْشِیْ (نکالنے والا) اور اسم مفعول بنے گا مُوْشٰی (یعنی نکالا ہوا) پس مُوشٰی کے معنے بنیں گے نکالا ہوا اور یہ معنے بائبل کے اس فقرہ سے بالکل ملتے ہیں جو کہا گیا کہ "اس سبب سے کہ میں نے اسے پانی سے نکالا" پس میرے نزدیک درحقیقت موسیٰ مُوشٰی تھا جس کا عبرانی تلفظ "موشے" ہے اور اس کے لفظی معنے صرف نکالے ہوئے کے ہیں۔

سب سے آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف تو یہ جدید محقق اس بات کو ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ نہ بنی اسرائیل مصر میں گئے اور نہ مصر سے واپس آئے۔ اور دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل مصر میں گئے اور ان کے سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام خود مصری تھے اور انکا مذہب بھی مصری تھا۔ اس تضاد سے ہی انسان سمجھ سکتا ہے کہ ان محققین کی باتوں کی بنیاد کتنی کمزور ہے۔ حق یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض اچھی تحقیقاتیں کی ہیں لیکن اس شوق نے ان کو خراب کیا ہے کہ ہر تحقیق کے نتیجہ کو اس مسئلہ تک محدود رکھنے کی بجائے اس کو سب مسائل پر حاوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح وہ ٹھوکر کھا گئے ہیں انکی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص آبخورا بنائے اور ساری دنیا کی پیدائش کا دعوے کرنے لگ جائے۔ آبخورا بنانا خود ایک اچھا کام ہے مگر آبخورے کے بنانے سے کوئی شخص دنیا کا خالق نہیں بن سکتا۔ اگر یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً ان کے کام کی دنیا میں بہت زیادہ قدر کی جاتی۔

دوسری دلیل یہ بیان کی گئی ہے کہ توحید کا خیال مصری ہے چونکہ یہ خیال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں میں پھیلایا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام مصری تھے۔ اس کے مندرجہ ذیل جواب ہیں۔

اوّل یہ خیال کر لینا کہ کوئی عقلی خیال محض کسی ایک قوم میں نشوونما پاتا ہے عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اگر ہم اس خیال کو درست تسلیم کر لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تمام علمی ترقی صرف چار یا پانچ اشخاص کے دماغوں میں ہوئی ہے اور باقی دنیا نے اُنکی نقل کی ہے اور یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں مختلف افراد اپنے گردوپیش کے حالات پر غور کر کے کچھ نتائج نکالتے رہے ہیں اور مختلف ممالک کے سینکڑوں آدمیوں کے خیالات میں توارد ہوتا رہا ہے اصولی خیال ایک رہا ہے۔ ماحول کے ماتحت کچھ کچھ تبدیلیاں مختلف ملکوں میں ہوتی رہی ہیں۔ توحید کا سوال تو ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک ملک کے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا تھا ہم تو دیکھتے ہیں سائنس کے جزوی مسائل کے بارہ میں بھی ایک ایک وقت میں کئی ممالک کے سائنسدانوں نے آزادانہ طور پر تحقیقات کر کے ایک قسم کے نتائج معلوم کئے ہیں اور کسی نے نہیں کہا کہ انہوں نے ایک دوسرے کی چوری کی ہے بلکہ دنیا نے تسلیم کیا ہے کہ یہ توارد ہوا ہے بے تار برقی کے متعلق ہی ایک وقت میں مارکونی کے علاوہ اور سائنسدان بھی تو یہ کر رہے تھے اور وہ اپنے طور پر اس بارہ میں کئی حقائق کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے پس یہ خیال کرنا بالکل درست نہیں کہ چونکہ مصریوں میں توحید کا خیال پایا جاتا تھا اس لئے یہ خیال کسی اور قوم میں نہیں ہو سکتا تھا اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری توحید کو پھیلاتے تھے اس لئے وہ مصری تھے۔

ایک لحظہ کے لئے فرض کر لو کہ یہ اصول بھی درست ہے تو پھر بھی اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکلا کہ موسیٰ مصری تھے کیا قانون قدرت کا یہ بھی کوئی قاعدہ ہے کہ مصری خیال کو مصری ہی پھیلا سکتا ہے کوئی اسرائیلی نہ اس خیال کو تسلیم کر سکتا ہے نہ اس کو پھیلا سکتا ہے

اگر یہ درست بھی ہے کہ توحید صرف مصر میں ہی پائی جاتی تھی تو کیا اس بات کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اسرائیلی نسل کے ایک شخص موسیٰ کو یہ خیال بھایا اور اُس نے یہ خیال اپنی قوم میں پھیلا دیا۔

۲۱۰ ان دلیل کا رد کہ توحید کا خیال مصری ہے۔ اور حضرت موسیٰ کا توحید کے خیالات پھیلانا ان کے مصری ہونے کی دلیل ہے

میرے یہ جوابات اس مسئلہ پر صرف علمی تنقید کا رنگ رکھتے ہیں ورنہ حق یہ ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے توحید کا خیال ایجاد کیا اور نہ اسلام یہ کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس خیال کو ایجاد کیا۔ تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء اپنے خیالات نہیں پھیلاتے بلکہ خدا تعالیٰ کی وحی کو پھیلاتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ توحید کا خیال ابتدائے عالم سے دنیا میں خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام کیا گیا ہے۔ اگر خدا ایک ہے اور اگر وہ شروع سے الہام کرتا چلا آیا ہے تو یہ سیدھی سادی بات ہے کہ وہ اپنے نبی کو یہی کہے گا کہ میں ایک ہوں یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک خدا پہلے نبیوں سے تو یہ کہتا رہے کہ میں دو ہوں یا تین ہوں یا چار ہوں لیکن ”عمون ہوتپ“ کو آ کر یہ کہے کہ میں ایک ہوں۔ یہ سارا دھوکا الہام اور اس کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مذہب کی تو بنیاد ہی الہام پر ہے۔ اگر الہام نہیں تو مذہب صرف ایک ڈھکوسلا رہ جاتا ہے پھر موسیٰ اسرائیلی ہوں مصری ہوں یا کچھ ہوں اُنکی ذات بالکل بے حقیقت رہ جاتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عظمت اور شان تو خدائی الہام کی وجہ سے ہے اور اگر خدائی الہام کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ توحید تمام انبیاء کی تعلیم کا جزو اعظم رہا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے وجود کو ظاہر کرنے کے لئے ”عمون ہوتپ“ کے پیدا ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں قرآن کریم مکہ کے رہنے والوں کے سامنے متواتر یہ بات پیش کرتا ہے کہ تمہارا دادا ابراہیمؑ موحد تھا اور حضرت ابراہیمؑ یقیناً حضرت موسیٰ سے پہلے کے آدمی ہیں مکہ کے لوگ خود مشرک تھے لیکن انکو اس بات کی تردید کی جرأت کبھی نہ ہوئی اور ایک قول بھی کسی تاریخ میں ایسا نہیں ملتا کہ مکہ کے لوگوں نے آگے سے جھوٹے طور پر بھی کہا ہو کہ ابراہیمؑ مشرک تھا۔ پس یہ ایک تاریخی شہادت اس بات کی ہے کہ قریش تو اسرائیلیوں سے دور بستے تھے اور اپنے آپ کو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے قرار دیتے تھے وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خدا کے ماننے والا قرار دیتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اگر توحید "عمون ہوتپ" سے سیکھی تھی تو کوئی کے ان آٹھ لوگوں نے توحید کا علم کس سے حاصل کیا۔ کیا یہ بھی مصر سے سیکھ کر آئے تھے۔ وہ تو خود مشرک تھے ان کا تو فائدہ اس میں تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک قرار دیتے مگر باوجود اسکے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے موحد ہونے کا کبھی انکار نہیں کیا۔ پس یہ کہنا کہ "عمون ہوتپ" سے توحید شروع ہوئی ہے بالکل درست نہیں۔ دُنیا کی مختلف تاریخیں ایک خدا کا خیال قدیم زمانہ سے پیش کرتی چلی آئی ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کے الہام نے دُنیا کے ہر گوشہ میں توحید کے خیال کو زندہ اور قائم رکھا ہے۔ شرک سے توحید پیدا نہیں ہوئی بلکہ توحید کے بعد کمزوری اور ضعف کے دنوں میں شرک کے خیالات پیدا ہوئے ہیں۔

۲۱۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ختنہ کی رسم جاری کرنا ان کو مصری ثابت نہیں کرتا۔

تیسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ ختنہ مصریوں میں رائج تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اسکی تعلیم دی پس معلوم ہوا کہ وہ مصری تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

اوّل تو یہ استدلال غلط ہے کہ ختنہ کی رسم کے جاری کرنے کی وجہ سے موسیٰ مصری ثابت ہوتے ہیں کیونکہ فرض کرو ختنہ مصر ہی میں رائج تھا تو کیوں یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ بنی اسرائیل نے مصری رہائش کے دنوں میں مصریوں کے اثر کے ماتحت ختنہ کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے یہ بات بھی غلط ہے کہ ختنہ مصریوں میں ہی رائج تھا۔ بائبل کہتی ہے کہ ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کئی سو سال پہلے خدا تعالیٰ کے حکم سے کروایا اور اپنی اولاد کے لئے ختنہ کرانا ضروری قرار دیا اور نہ صرف خود اپنا ختنہ کرایا بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق کا بھی ختنہ کرایا اس بات کا ثبوت کہ بائبل کا یہ بیان درست ہے یہ ہے کہ عرب جن کے سوشل تعلقات اسرائیلیوں سے اچھے نہیں تھے اور جو کبھی مصر نہیں گئے اُن میں بھی ختنہ کی رسم پائی جاتی ہے اور اُنکی روایات کے مطابق بھی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کے ذریعہ سے یہ رسم اُن میں قائم ہوئی۔ بائبل کے متعلق تو یہ جدید محقق کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ نے اُن کو ختنہ کی تعلیم دی کیونکہ وہ مصری تھے اور جب ختنہ کی تعلیم ان میں آگئی تب بنی اسرائیل نے اس تعلیم کو اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی منسوب کر دیا۔ مگر یہ لوگ عرب کے متعلق کیا کہیں گے۔ عربوں کو تو نہ اسرائیلیوں کی تاریخ سے کوئی دلچسپی تھی نہ موسیٰ علیہ السلام سے انکو کوئی ہمدردی تھی بلکہ وہ تو اسماعیل علیہ السلام کے سوتیلے بھائی اسحاق علیہ السلام کی وجہ سے اسرائیلیوں سے عناد رکھتے تھے اور اسرائیلی اُن سے خار کھاتے تھے۔ اُن میں بھی اس رسم کا ہونا اور اُن کا بھی اس رسم کا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی طرف منسوب کرنا صاف بتاتا ہے کہ ختنہ کی رسم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی معرفت چلی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری قرار دینے والے محقق درحقیقت ایک خطرناک غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں عربوں میں ختنہ کا رواج مدت سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت "فلاس ٹارگی اُس" بھی دیتا ہے جو مسیح سے ۲۰۴ سال پہلے گذرا ہے (دیکھو جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۹۷) مگر سب سے بڑی شہادت خود عربوں کی قومی شہادت ہے خواہ وہ مسلم تھے یا غیر مسلم۔ علاوہ ازیں جیوئش انسائیکلوپیڈیا والا لکھتا ہے کہ ختنہ کی رسم علاوہ یہودیوں اور مسلمانوں کے اور قوموں میں بھی پائی جاتی تھی اور پائی جاتی ہے چنانچہ ایبے سینین عیسائی بھی ختنہ کراتے ہیں۔ افریقہ کے وحشی قبائل میں تو یہ رسم اتنی وسیع ہے کہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا کے بیان کے مطابق اُن قبائل کا نام لینا آسان ہے جو ختنہ نہیں کراتے بہ نسبت اُن قبائل کے جو ختنہ کراتے ہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا کے پُرانے قبائل بھی ختنہ کراتے تھے جن کا کوئی تعلق مصر سے ثابت نہیں ہو سکتا (دیکھو ٹرائبز آف سنٹرل آسٹریلیا مصنفہ سپنسر اینڈ گلن ص ۳۲۳)

امریکہ میں بھی کیا شمالی اور کیا جنوبی اور کیا وسطی یہ رسم پائی جاتی تھی (جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صفحہ ۹۷) ان

حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف مصریوں میں اس رسم کا پایا جانا غلط خیال ہے۔ اگر باوجود مصر سے تعلق نہ رکھنے کے افریقہ کے اکثر قبائل میں آسٹریلیا کے قبائل میں۔ شمالی جنوبی اور وسطی امریکہ کے قبائل میں اور عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا تو اس بات کے ماننے میں کیا مشکل ہے کہ اسرائیلی بھی ختنہ کرایا کرتے تھے۔

حق یہ ہے کہ مصر میں ختنے کا پُرانے سے پُرانا ثبوت ایک مصری بادشاہ کی ممی سے جس کا نام ایمن این ہب AMEN-EN-HEB تھا ملتا ہے اس بادشاہ کا زمانہ ۱۴۱۴ قبل مسیح سے ۱۵۵۵ قبل مسیح تک تھا (دیکھو جیوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ صہ۹۔ بحوالہ آر چئو فور انتھر ARCHIVFUR ANTHER صفحہ ۱۲۳) اور یہ زمانہ حضرت یوسف علیہ السلام اور انکے خاندان کی مصر میں ہجرت کے بعد کا ہے غرض ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں ختنے کا قدیمی ثبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صرف دو سو سال قبل ملتا ہے ہم آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے بادشاہوں کا خاص قُرب حاصل ہو گیا تھا ان کی تعلیم کے ماتحت مصر کے بادشاہوں اور ان کے گردوپیش کے اُمراء میں ختنہ کا رواج شروع ہو گیا تھا چنانچہ مصری علوم کے محققین کی عام رائے بھی یہی ہے کہ مصر میں ختنے کا رواج زیادہ تر بادشاہوں اور پادریوں میں تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری ہونے کے حق میں چوتھی دلیل یہ دی گئی ہے کہ عمون ہوتپ کے مذہب میں بعث بعدالموت کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں بھی بعث بعدالموت کا کوئی ذکر نہیں۔

اس دلیل میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اوّل خامی تو یہ ہے کہ عمون ہوتپ کا سارا مذہب معلوم نہیں۔ اس نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ اگر چھوڑی ہے تو وہ موجود نہیں اور نہ اُس نے کوئی جماعت چھوڑی ہے پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ عمون ہوتپ کے مذہب میں اس تعلیم کا ذکر نہیں۔ جب عمون ہوتپ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی تو کیونکر معلوم ہوا کہ اس کی تعلیم میں بعث بعدالموت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ کتاب نہ چھوڑی ہوتی جماعت ہی چھوڑی ہوتی تو ہم اس جماعت کے اقوال سے اس کا اندازہ لگا سکتے مگر ایسی کوئی جماعت بھی عمون ہوتپ نے نہیں چھوڑی پس یہ کہنا کہ اس کی تعلیم میں یہ بات نہ تھی ایک غیر معقول بات ہے۔

دوسرے ان لوگوں نے یہ بھی ثابت نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بعث بعدالموت کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں یہ ذکر پایا جاتا ہے اسی طرح اُن کے تابع نبیوں کی تعلیم میں بھی یہ ذکر پایا جاتا ہے چنانچہ ذیل میں دو حوالے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درج کئے جاتے ہیں۔

تورات میں لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اور اس پہاڑ پر جس پر تُو جاتا ہے مرجا اور اپنے لوگوں میں شامل ہو جیسے تیرا بھائی ہارون ہور کے پہاڑ پر مر گیا اور اپنے لوگوں میں جاملا" (استثناء باب ۳۲۔ آیت ۵۰) اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اُن لوگوں سے اے خداوند جو تیرے ہاتھ ہیں دُنیا کے لوگوں سے جن کا بخرہ اسی زندگانی میں ہے اور جن کے پیٹ تو اپنی نہانی چیزوں سے بھرتا ہے ان کی اولاد بھی سیر ہوتی اور وے اپنی باقی دولت اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں پر میں جو ہوں صداقت میں تیرا مُنہ دیکھوں گا اور جب میں تیری صورت پر ہو کے جاگوں گا تو میں سیر ہوں گا" (زبور باب ۱۷ آیت ۱۴، ۱۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصری ثابت کرنے کی چوتھی دلیل کا رد کہ آپ کے مذہب میں بعث بعدالموت کا ذکر نہیں۔ اس لئے آپ مصری ہیں۔

ان حوالوں سے صاف ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعث بعدالموت کے قائل تھے اور تورات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بھی اس کے قائل تھے اور زبور میں اس کا ذکر موجود ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عہد نامہ قدیم میں بعث بعدالموت پر اس قدر زور نہیں دیا گیا جیسا کہ زرتشتی مذہب یا اسلام میں دیا گیا ہے یا ہندو مذہب میں دیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے

کہ یہودی لوگ بہت ہی دُنیادار تھے۔ جب تورات حوادثِ زمانہ سے مٹی اور یہودیوں نے پھر دوبارہ اُس کو جمع کیا تو انہوں نے تعمداً کے اُن پیشگوئیوں کو تو جمع کر لیا جو دُنیوی ترقی کے متعلق تھیں لیکن اُن امور کی چنداں پروا نہ کی جن سے اُن کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس طرح کئی حصے رہ گئے جن میں سے ایک بعث بعد الموت کا بھی حصہ تھا مگر باوجود اسکے جیسا کہ میں نے بتایا ہے اب بھی بعث بعد الموت کا ذکر تورات اور دوسرے انبیاء کے صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔

۱۴۳ کیا موسیٰ علیہ السلام کا سور کو حرام قرار دینا مصری تعلیم کے زیر اثر تھا؟

پانچویں دلیل یہ دی گئی ہے کہ سور بنی اسرائیل میں حرام ہے اور یہی بات مصری تعلیم میں پائی جاتی ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ استدلال ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ خیال کہ مصری لوگوں میں سور حرام تھا درست نہیں۔ جو کچھ مصری تعلیم کے متعلق ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ مصری لوگ سور کے گوشت کو زیادہ استعمال نہیں کرتے تھے لیکن اسکی حرمت کا ثبوت نہیں ملتا۔ (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جلد ۴ کالم ۵۲۵، ۴ بحوالہ کتاب ایجپٹ (EGYPT) صفحہ ۱۴۴ مصنفہ ارمن (ERMAN) بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ بات ہے کہ مصر میں بعض جگہ پر سور پالے جاتے تھے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کے اسی صفحہ پر رینی (RENNI) کے متعلق لکھا ہے کہ اُس کے مال میں تین سو سور بھی تھے اور یہ رینی الکاب (EL-KAB) کے مندر کے دیوتا کا کاہن تھا اور ہیروڈوٹس (HERODOTUS) لکھتا ہے کہ سیلین (SALENE) اور ڈایونیسس (DIONYSUS) یعنی اوسی رس (Osiris) کے ناموں پر سوروں کی قربانی کی جاتی تھی اسی طرح پاہیری (PAHERI) جو شاہانِ مصر کے اٹھارویں حاکم خاندان کا بادشاہ تھا اس کی قبر پر سوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں (یہ تمام حوالے انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کالم ۴۸۲۵ و ۴۸۲۶ پر دیکھیں)

اسی طرح پروفیسر اڈولف لاڈز (Adolphelods) جو پیرس کی سار بان (Sorbonne) یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں اپنی کتاب اسرائیل میں لکھتے ہیں کہ مصر میں عام طور پر تو سور کے گوشت سے پرہیز کیا جاتا تھا لیکن خاص خاص چاندوں کی چودھویں تاریخوں پر "سی لین" اور "ڈایونیسس" کے مندروں پر اُسکی قربانی کی جاتی تھی اور اُن کے پجاری اُسے کھاتے تھے (کتاب اسرائیل صفحہ ۲۲۸) پس یہ کہنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ سور کے کھانے سے روکا اس لئے وہ مصری تھے درست نہ ہوا کیونکہ خود مصریوں میں سور کی پوری ممانعت نہیں اور جن قبائل میں ممانعت ہے ان میں بھی اس کو گندہ قرار دے کر ممانعت نہیں بلکہ ایک مقدس جانور قرار دیکر ممانعت ہے تبھی تو خاص خاص تہواروں پر مندروں میں اسکی قربانی کی جاتی تھی اور پجاری لوگ اس کو کھاتے تھے۔

سور کو پاکیزہ جانور قرار دینا صرف میرا قیاس نہیں بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا ببلیکا والا لکھتا ہے کہ ایشیائے کوچک، یونان اور اٹلی میں سور کو خاص عزت حاصل تھی اسی طرح پروفیسر لوڈز (LORDS) لکھتے ہیں کہ سور بنی اسرائیل کے بہت سے ہمسایوں کے نزدیک ایک مقدس جانور تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس پر خدا تعالیٰ کی تقدیس نازل ہوتی ہے بابل کے لوگوں میں ننیب (NINIB) کی وجہ سے اور شامی لوگوں میں تموز (TAMMUZ) کی وجہ سے یہ مقدس سمجھا جاتا تھا چنانچہ شامیوں میں تموز کے نام جو مہینہ مقرر کیا گیا تھا اس کا نام خنزیرہ یعنی خنزیر (سور) تھا (دیکھو کتاب اسرائیل صفحہ ۲۲۸ بحوالہ ڈی کالکن شرفلتی اُنڈ داس آلتے ٹیسٹامینٹ مصنفہ ہائن رچ زمرن اور ہیوگو ونکلر)۔ ان حوالوں سے مزید تقویت اس خیال کو پہنچتی ہے کہ مصری لوگوں میں خنزیر کے ذبیحہ سے اجتناب اُسکی تقدیس کی وجہ سے تھا نہ کہ اُسے بُرا سمجھنے کی وجہ سے لیکن جیسا کہ بائبل سے ظاہر ہے یہود میں اُسے بُرا اور گندا قرار دیا گیا ہے پس سور کی حرمت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے کسی صورت

یہ بھی درست نہیں ہو سکتا۔

چھٹی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مصری النسل ہونے کی تائید میں یہ دی جاتی ہے کہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی طرح کلام نہیں کر سکتے تھے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ غیر نسل سے تھے اور یہودیوں کی زبان میں اُن سے کلام نہیں کر سکتے تھے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام صفائی کے ساتھ کلام نہیں کر سکتے تھے وہ تو ایک حد تک درست ہے بائبل میں بھی یہ ذکر ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے خروج باب ۳ میں لکھا ہے۔

"پس اب تو جا میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔ موسےٰ نے خدا کو کہا میں کون ہوں جو فرعون کے پاس جاؤں اور بنی اسرائیل کو مصر سے نکالوں (آیت ۱۰ و ۱۱)

اس کے بعد ان مختلف ہدایتوں کا ذکر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملیں پھر اس سلسلۂ کلام کے آخر پر یوں کہا گیا ہے کہ:۔

"تب موسےٰ نے خداوند سے کہا اے میرے خداوند میں فصاحت نہیں رکھتا نہ تو آگے سے اور نہ جب سے کہ تو نے اپنے بندے سے کلام کیا اور میری زبان اور باتوں میں لکنت ہے تب خداوند نے اُسے کہا۔ کہ آدمی کو زبان کس نے دی اور کون گونگا یا بہرا یا بینا یا اندھا کرتا ہے کیا میں نہیں کرتا جو خداوند ہوں۔ پس اب تو جا اور میں تیری بات کے ساتھ ہوں گا اور تجھ کو سکھاؤں گا جو کچھ تو کہے گا۔" (خروج باب ۴ آیت ۱۰ تا ۱۲)

قرآن کریم میں آتا ہے وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ أَلَا يَتَّقُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ۔ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ (الشعراء ع ۲) یعنی یاد کرو جبکہ تیرے رب نے موسےٰ سے کہا کہ ظالموں کی قوم یعنی فرعون کی قوم کے پاس جا اور انہیں کہہ کہ کیا وہ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ اے میرے رب میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ وہ میری تکذیب کریں گے اور اُن کی تکذیب کے خیال سے میرا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ اور میری زبان چلتی نہیں پس نبوت کو ہارون کی طرف بھیجئے۔

بائبل اور قرآن کے ان حوالوں سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کوئی نقص تھا اور انہوں نے خدا تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ میری زبان نہیں چلتی اس لئے میری جگہ کسی اور کو بھیجئے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی بائبل اور قرآن دونوں کے حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان نہ چلنے کا عذر اس وقت کیا ہے جب انہیں فرعون کے پاس جاکر تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس عذر کے یہ معنے کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی یا اعصابی طور پر کچھ ایسی کمزوری تھی کہ جب انہیں جوش آجاتا تھا تو وہ صفائی سے اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر سکتے تھے اور الفاظ یا حروف کو حذف کر دیتے تھے اور یا ہم یہ معنے کریں کہ جس قوم کو مخاطب کرنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا اسکی زبان میں وہ اچھی طرح کلام نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اول الذکر معنے لئے جائیں تو پھر یہ استدلال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری تھے بالبداہت باطل ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ زبان میں لکنت کا ہونا یا کسی شخص میں ایسی اعصابی کمزوری کا پایا جانا کہ جوش والی تقریر میں عبارت اسکے قابو میں نہ رہے۔ یہ مصریوں کا خاصہ نہیں۔ بنی اسرائیل میں بھی یہ مرض ایسی ہی پائی جاسکتی ہے جیسا کہ مصریوں یا کسی اور قوم میں۔ اور اگر دوسرے معنے کئے جائیں یعنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عذر سے مراد زبان کا نہ جاننا ہے تو پھر تو یہ اس بات کا یقینی ثبوت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصری نہ تھے کیونکہ بائبل بھی یہی بیان کرتی ہے اور قرآن کریم بھی یہی بیان کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ عذر اُس وقت پیش کیا ہے جب انہیں

اس دلیل کا رد کہ چونکہ حضرت موسیٰ اچھی طرح کلام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ مصری تھے

فرعون کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا کوئی عقلمند یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مصری موسیٰ مصری فرعون کو تبلیغ کرنے کا حکم سن کر یہ عذر کرے گا کہ مجھے مصری زبان نہیں آتی۔ اگر وہ مصری تھے تو اُن کو تو وہ زبان آتی تھی جو فرعون بولتا تھا۔ پس اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عذر کی یہ تشریح کی جائے کہ وہ اُس زبان کے نہ جاننے کا عذر کرتے ہیں جس سے اُن کا مخاطب واقف ہے تو پھر اس سے یقینی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اسرائیلی تھے چونکہ فرعون کو تبلیغ کرنے کا اُنہیں حکم دیا گیا اور وہ فرعون کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتے تھے انہوں نے خدا تعالیٰ سے یہ عذر کیا کہ جس شخص کو تبلیغ کرنے کا آپ نے مجھے حکم دیا ہے میں اُسکی زبان اچھی طرح نہیں جانتا یعنی میں عبرانی زبان کا ماہر ہوں اور وہ مصری زبان بولنے والا ہے۔ پس یہ استدلال نہایت ہی بودہ۔ نہایت ہی کمزور اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کہ

قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتب دیئے جانے پر ریورنڈ ویری کا اعتراض اور اس کا جواب

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم اور بائبل کا دعویٰ کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے صحیح ہے اور محققین جدید کا یہ دعویٰ کہ وہ مصری تھے نہایت غلط اور خلافِ عقل ہے۔ حق یہ ہے کہ کوئی ثبوت اِس بات کی تائید میں نہیں ملتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی نہ تھے لیکن بیسیوں ثبوت اس بات کی تائید میں ہیں اور پیش کئے جاسکتے ہیں اور بعض اوپر پیش کئے گئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسرائیلی تھے۔

اَلْکِتَاب فرماتا ہے ہم نے اِس جگہ پر موسیٰ کو کچھ احکام دیئے۔ کتاب کے معنی جیسا کہ حلِّ لغات (سورہ بقرہ ۳) میں بتایا گیا ہے مفروضات کے ہوتے ہیں یعنی فرض کی گئی باتیں۔ پس اَلْکِتَاب سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہاں بعض نہایت ہی تاکیدی احکام عطا فرمائے ریورنڈ ویری نے اپنی تفسیر میں اِس آیت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہاں ہمیں محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہودی تاریخ سے ناواقفیت کی ایک مثال ملتی ہے جیسا کہ اَور بھی کئی مثالیں اِس سورۃ میں ہمیں ملتی ہیں اور وہ مثال یہ ہے کہ اِس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ کی تشریح

اِس پہاڑ پر دی گئی تھی۔ حالانکہ وہاں ان کو صرف الواح ملی تھیں پس قرآن کریم کا بیان ایک اسرائیلی تاریخ سے ناواقف انسان کا بیان ہے۔

میرے نزدیک پادری صاحب کو (اوّل) بائبل پر حد سے زیادہ حسن ظنی معلوم ہوتی ہے جسکی وہ مستحق نہیں (دوم) قرآن کریم سے اُن کو اتنی دشمنی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے وہ اپنی نجات کے لئے اُس پر اعتراض کرنا ہی کافی سمجھتے ہیں اُن کا بغیر کسی بیرونی شہادت کے بائبل کے بیان کو صحیح قرار دینا نہایت خلافِ عقل بات ہے بائبل کے تو باب باب کی خود عیسائی مصنفین نے ایسی دھجیاں اڑائی ہیں کہ اسکی کسی بات کی تصدیق بیرونی شہادت کے بغیر ناممکن ہے۔ پادری صاحب کہتے ہیں بائبل سے ثابت ہے کہ طُور پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح ملی تھیں چونکہ قرآن اس کے خلاف کہتا ہے اس لئے قرآن جھوٹا ہے اور وہ (نعوذ باللہ) ایک جاہل انسان کی تصنیف ہے مگر پادری ویری صاحب کو یہ خیال نہیں آیا کہ خود اُن کے ہم مذہب جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے ہیں اوّل تو موسیٰ علیہ السلام کے ہی منکر ہیں۔ پھر اگر موسیٰ علیہ السلام کے قائل ہیں تو وہ اسے ایک مصری نژاد انسان بتاتے ہیں اور بعض اُن میں سے بنی اسرائیل کے مصر جانے کے ہی قائل نہیں کجا یہ کہ وہاں سے خروج کے قائل ہوں۔ پھر جس طُور کے متعلق پادری ویری صاحب کا خیال ہے کہ وہاں دو الواح ملی تھیں محققین جدید اوّل تو اِس طُور کے ہی منکر ہیں اور اگر اسے مانتے ہیں تو مصر اور عرب اور شام کے درمیانی علاقہ میں مختلف مقامات پر اسکی تعیین کرنا چاہتے ہیں۔ بائبل کے جو بیانات تاریخ کے رو سے اتنے مجروح ہیں اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناواقفیت ہے کہ انہوں نے بائبل کے خلاف بات لکھ دی صرف اتنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ پادری ویری صاحب کو نہ بائبل کا علم ہے اور نہ اُن تاریخوں کا جو بائبل کے متعلق نئے انکشاف کی بناء پر لکھی گئی ہیں۔

قرآن کریم کے متعلق اُن کو جو تعصب ہے اُس کا ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ قرآن کریم میں طُور پر ساری بائبل کے اُترنے کا کہیں ذکر نہیں بلکہ بائبل کے بیان کے موافق جسے ویری صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے بعض احکام اور الواح کے اُترنے کا ہی ذکر ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ○ (الاعراف ع ۱۷)

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے الواح میں ہر ایک ضروری امر کے متعلق نصیحت لکھ دی اور ہر ایک ضروری امر کی تفصیل بیان کر دی اور اُسے کہا کہ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ و اور اپنی قوم سے کہو کہ وہ اس کے احکام کی اچھی طرح نگہداشت رکھیں۔ میں تم کو بدکاروں کا انجام دکھاؤں گا۔ اِن آیات سے ثابت ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے طُور پر الواح دی تھیں لیکن نہ قرآن اِس کو تسلیم کرتا ہے اور نہ بائبل یہ دعوےٰ کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سوائے الواح کے اور کچھ نہیں ملا۔ پس ایک پادری کے قلم سے یہ لکھا جانا کہ ”بائبل صرف اتنا بتاتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو وہاں دو الواح ملی تھیں جن میں دس احکام تھے“ ایک نہایت ہی تعجب انگیز امر ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ اس موقعہ پر دیا گیا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے گوسالۂ سامری کی پُوجا شروع کر دی تھی اس کا خروج باب ۲۰ سے شروع کر کے خروج باب اکتیس ۳۱ تک ذکر کیا گیا ہے۔ اتنے بابوں کو یہاں درج تو نہیں کیا جا سکتا صرف خلاصہ اس جگہ بیان کر دیا جاتا ہے کہ باب ۲۰ میں اُن دس احکام کا ذکر کیا گیا ہے جو اس پہاڑ پر دیئے گئے تھے۔ باب ۲۱ میں غلاموں کے متعلق۔ اُس کے متعلق جس کا کان چھیدا گیا ہو۔ لونڈیوں کے متعلق۔ قتل کے متعلق۔ بردہ فروشوں کے متعلق۔ ماں باپ کو کوسنے والوں کے متعلق۔ مار پیٹ کرنے والوں کے متعلق۔ اتفاقی چوٹ کے متعلق۔ سینگ مارنے والے بیل کے متعلق۔ اور اُس شخص کے متعلق جس سے لوگوں کو اتفاقی نقصان پہنچ جائے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ باب ۲۲ میں چوری۔ نقصان دہی۔ امانت۔ قرض زناکاری۔ جادو۔ حیوانات سے بدصحبت کرنے والوں۔ بُت پرستی۔ پردیسیوں۔ بیواؤں۔ لاوارثوں۔ سُود خوری۔ رہن حاکم کی تعظیم اور پہلے پھلوں کی بابت احکام دیئے گئے ہیں باب ۲۳ میں تہمت۔ جھوٹی گواہی۔ انصاف۔ خیر خواہی صدقہ کے طور پر کھیت چھوڑنے۔ سبت۔ بُت پرستی۔ تین عیدوں۔ قربانی کے لہو اور چربی اور فرشتہ کے بھیجے کے متعلق احکام اور وعدے بیان کئے گئے ہیں۔ باب ۲۴ میں پھر دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پہاڑ پر جانے کا ذکر ہے اور باب ۲۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عبادت گاہ کے بناتے وقت بنی اسرائیل کیا کیا نذریں گذرانیں نیز صندوق کا ڈول کس طرح بنایا جائے۔ کفارے کا سرپوش معہ کروبیوں کے کس طرح بنایا جائے۔ میز اور اسکے ظروف کس طرح بنائے جائیں۔ شمعدان اور اُس کے آلات کس طرح بنائے جائیں۔ باب ۲۶ میں خیمے کے دس پردوں۔ بکری کے بال سے گیارہ پردوں۔ اور بکروں کی کھال سے بالا پوش بنانے خیمہ کے تختوں کُولھوں اور بینڈوں۔ نیز صندوق پردوں اور دروازوں کے پردوں کے بنائے جانے کے متعلق تعلیم ہے باب ۲۷ میں سوختنی قربانی کا مذبح اور اس کے اسباب مسکن کے صحن۔ اس کے پردوں اور ستونوں اور چراغ کے تیل کی بابت احکام دیئے گئے ہیں۔ باب ۲۸ میں ہارون علیہ السلام اور اُس کے بیٹوں کو کہانت کے لئے مخصوص کئے جانے پاک لباس بنانے کا حکم دیئے جانے۔ افود۔ عدل کی چپراس۔ اور اُریم و تمیم کے متعلق احکام اور پگڑیوں اور منقش کُرتوں اور ہارون علیہ السلام کے بیٹوں کے لباس کے متعلق احکام دیئے گئے ہیں۔ باب ۲۹ میں کاہن کے مقدس کرنے کے متعلق قربانی کی رسوم۔ دائم سوختنی قربانی کی رسوم۔ اور خدا کا بنی اسرائیل کے درمیان رہنے کا وعدہ بیان کیا گیا ہے۔ باب ۳۰ میں بخور

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ طور پر ملا۔ وہ صرف دس احکام تھے۔

کے مذبح خانوں کے فدیہ۔ برنجی حوض۔ مساحت کے مقدس تیل اور بخور کے بنانے کی ترکیبیں بیان کی گئی ہیں اور باب ۳۱ میں کچھ اور ہدائتیں دینے کے بعد ان کے ساتھ دو لوحیں سپُرد کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اتنے بابوں کی تعلیم کو پادری ویری صاحب کس طرح بھُول گئے۔ بارہ بابوں میں ان احکام کا ذکر ہے جو طُور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے اور انہی میں سے صرف نصف میں (دس احکام) اور لوحوں کا ذکر ہے۔ مگر باوجود اسکے پادری صاحب کہتے ہیں کہ وہاں لوحوں کے سوا کچھ نہیں ملا اور قرآن کریم کا یہ کہنا کہ وہاں لوحوں کے سوا کچھ اور بھی ملا تھا قرآن کریم کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

لفظ فرقان کے متعلق ریورنڈ وہیری کا اعتراض کہ یہ لفظ شامی ہے۔

باقی رہا پادری صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن کریم کے نزدیک ساری تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر دی گئی تھی یہ دعویٰ بلا دلیل ہے الکتاب کے معنی ساری کتاب کے نہیں بلکہ الکتاب کے معنے کچھ حصہ کتاب کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم میں ایک معمولی خط کا نام بھی کتاب رکھا گیا ہے۔

الکتاب کے معنے

سورۂ نمل میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سبا کی ملکہ کو ایک خط لکھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے پیغامبر کو ایک خط لکھ کر دیا اور کہا اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ○ قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْۤ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ○ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ (نمل ع ۲) یعنی تُو یہ میری کتاب لے جا اور سبا کے لوگوں کے سامنے اسے پیش کر دے۔ پھر پیچھے ہٹ کے کھڑا ہو جائیو اور دیکھیو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں جب پیغامبر نے اس کے مطابق عمل کیا اور وہ خط سبا والوں کے سامنے پیش کر دیا تو سبا کی ملکہ نے کہا اے میرے سردارو میرے سامنے ایک عزت کتاب پیش کی گئی ہے وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مجھ پر ظلم نہ کرو۔ اور فرمانبردار بن کر میرے پاس آجاؤ۔

یہاں کتاب صرف ڈیڑھ یا دو سطر کے ایک خط کا نام رکھا گیا ہے۔ پس محض کتاب کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے مراد ساری تورات ہے صرف اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ کسی طرح قرآن کریم پر اعتراض کیا جائے خواہ سچائی کو فائدہ پہنچتا ہو یا نقصان۔

لفظ فرقان فرقان کے متعلق ریورنڈ ویری نے اپنی تفسیر میں رومن اُردو قرآن کے حوالہ سے جو ایک عیسائی کی مختصر تفسیر ہے لکھا ہے کہ یہ لفظ شامی زبان سے مستعار لیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) افرائیم شامی کی تفسیر بائبل سے واقف تھے جس میں متواتر بائبل کو فرقان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ پادری ویری صاحب اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لفظ شامی زبان سے لیا گیا ہے لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی شامی یا عبرانی عیسائی کتاب کی واقفیت تھی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات تاریخ کلیسیا کے واقعات سے نہایت ہی مختلف ہیں پس وہ صرف سُنی سُنائی حکایات پر مبنی کہے جا سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی شامی کتاب سے واقف ہونا یا نہ ہونا تو ایک ایسا سوال ہے جس کا اس موقع سے کوئی تعلق نہیں اور نہ کوئی معقول آدمی اس کو تسلیم کر سکتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف چند ہفتوں کے لئے شام میں ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ گئے تھے۔ اس عرصہ میں آپ کا شامی زبان سیکھ جانا اور اس کے لٹریچر کا مطالعہ کر لینا یہ صرف ایک فاتر العقل انسان کا ہی خیال ہو سکتا ہے کوئی معقول آدمی اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ انگریز چالیس چالیس سال تک ہندوستان میں رہتے ہیں مگر پھر بھی ہزاروں میں سے کوئی ایک ہوتا ہے جو اُردو زبان کو پڑھ سکتا ہو۔ وہ نہ تحریری زبان تو الگ رہی بولنے والی زبان سے بھی وہ بالکل کورے ہوتے ہیں پھر اس تجربہ کے ہوتے ہوئے کسی مصنف کا یہ کہنا کہ صرف چند

ہفتوں کے اندر اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تجارتی کاموں کے علاوہ شامی زبان بھی سیکھ لی تھی اور نہ صرف شامی زبان سیکھ لی تھی بلکہ شامی زبان کے لٹریچر سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی صرف اُس تعصب کو ظاہر کرتا ہے جو مسیحی اقوام کے دلوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق پیدا ہو چکا ہے۔

باقی رہا فرقان کا شامی لفظ ہونا یہ بھی عربی زبان سے ناواقفیت کی علامت ہے تعجب ہے کہ وہ لوگ جو عربی زبان سے کوئی مس نہیں رکھتے وہ قرآن کریم کی تفسیر یں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں جو عربی زبان کا بہترین نمونہ اور اُسکی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔

فُرْقَان کا لفظ درحقیقت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے بہت سے صیغے مختلف شکلوں میں عربی زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اِس آیت سے پہلے ہی وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ آچکا ہے اسی طرح عربی زبان میں فَرَقَ فَرَّقَ فَارَقَ اَفْرَقَ تَفَرَّقَ تَفَارَقَ اِنْفَرَقَ اِفْتَرَقَ فَارُوْقٌ فَرَاقٌ فَرْقٌ فَرُوْقٌ فُرْقَان فُرُقٌ فِرْقٌ فَرَقٌ فَرِيْقٌ فَرْقَاءُ فِرْقَةٌ فَرُوْقٌ فَرِيْقَةٌ اَفْرَقُ تَفَارِيْق مَفْرَقٌ مَفْرِقٌ مُفْرِقٌ مُنْفَرَقٌ مُفْتَرِقٌ وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو سب کے سب فرقان کے مادے سے ہیں اگر یہ لفظ شامی زبان سے مستعار لیا گیا ہے تو تمام کے تمام الفاظ عربی زبان میں کہاں سے آگئے اور اگر یہ الفاظ عربی زبان کے ہیں تو اس مادے کا جو مصدر ہے وہ شامی کس طرح ہو گیا ہاں ایک صورت ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ فرقان کا وزن عربی زبان کے اوزان میں سے نہ ہوتا اِس صورت میں بیشک کہا جا سکتا تھا کہ گو یہ مادہ عربی زبان کا ہے مگر چونکہ فرقان کا وزن عربی میں مستعمل نہیں اس لئے یہ لفظ شامی زبان سے لیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں فرقان کا وزن عربی زبان میں بکثرت استعمال ہوتا ہے چنانچہ سُبْحَان خدا تعالیٰ کا نام ہے قُرْآن قرآن کریم کا دوسرا نام ہے۔ نُعْمَان فقہ کے مشہور امام حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نام کا جزو ہے کُفْرَان کفر کو کہتے ہیں۔ فُقْدَان کے معنے غائب ہو جانے کے ہیں پس یہ وزن بکثرت عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور اس وزن کے سینکڑوں الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں پس جبکہ فرقان کا مادہ بھی عربی زبان میں مختلف شکلوں میں کثرت سے استعمال میں آتا ہے اور فرقان کا وزن بھی عربی زبان کا وزن ہے اور اس قسم کے سینکڑوں الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے ہیں اسے شامی کہنا ناواقفیت اور جہالت کی علامت نہیں تو اور کیا ہے مگر میں اس سے بڑھ کر ایک اور ثبوت اس بات کا دیتا ہوں کہ یہ لفظ عربی کا ہے بلکہ اس مادے کو پورے طور پر صرف عربی نے ہی استعمال کیا ہے اور شامی اور عبرانی زبانیں جو عربی کی فرعیں ہیں اگر اُن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے تب بھی وہ اس پوری حکمت اور شان کا حامل نہیں جس حکمت اور شان کا حامل یہ عربی لفظ ہے۔

(حاشیہ: ۱ اس بات کا رد کہ فرقان شامی لفظ نہیں)

یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں صرف لفظ کے معنے نہیں ہوتے بلکہ لفظ جن حروف سے مرکب ہوتا ہے اس کے اصل معنوں پر وہ دلالت کرتے ہیں چنانچہ حروف کے مقام اور مختلف حروف کے مشابہ حروف کے اندر بھی معنوں کا ایک تسلسل پایا جاتا ہے مثلاً ایک لفظ ف ر ق سے بنتا ہے جیسے فُرْقَان تو ایک تو اس لفظ کے مخصوص معنے عربی زبان میں ہونگے اور ایک معنوں کی فلسفیانہ حکمت ہوگی جو نہ صرف اس لفظ میں پائی جائے گی بلکہ تمام ان الفاظ میں بھی پائی جائیگی جو ف ر ق سے بنے ہوں اور ان میں بھی اصولی طور پر وہی معنے یا اس کے مخالف معنے پائے جائیں گے۔ مخالف معنے بھی ایک مشارکت رکھتے ہیں یعنی ان کی وجہ سے ذہن میں دوسرے معنے آجاتے ہیں چنانچہ عربی زبان میں بہت سے ایسے لفظ پائے جاتے ہیں جو مخالف معنے دیتے ہیں مثلاً ظَنٌّ ہے کہ اس کے معنی شک کے بھی ہیں اور یقین کے بھی۔ اسی طرح رِجَاءٌ کا لفظ ہے اس کے معنی امید کے بھی ہیں اور خوف کے بھی ہیں ایسے الفاظ کے لئے اصطلاحاً اضداد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنے اس لفظ

(حاشیہ: ۲ اس بات کا ثبوت کہ فرقان عربی لفظ ہے)

میں ایک دوسرے کے ضد معنے پائے جاتے ہیں۔ بعض عربی زبان کے ماہروں نے عربی زبان کے اضداد پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور بعض نے اس قسم کے الفاظ جو قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں ان کو یکجائی طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً اسی لفظ فُرْقَان کو لے لو یہ ف ر ق سے بنا ہے اگر عربی زبان میں ان تین حرفوں کو آگے پیچھے کر کے اور الفاظ بنتے ہوں تو فرق کے اندر جو اصولی معنے پائے جاتے ہیں وہی ان میں بھی پائے جائیں گے مثلاً اگر ف پہلے آ جائے اور ق ر پیچھے چلے جائیں یعنی فَقْر بن جائے یا ر پہلے آ جائے اور ف ق پیچھے جائیں یعنی رَفق بن جائے یا ر پہلے آ جائے اور ق ف پیچھے چلے جائیں اور رقف بن جائے یا ق پہلے آ جائے اور ف ر پیچھے چلے جائیں یعنی قَفر بن جائے یا ق پہلے آ جائے اور ر ف پیچھے چلے جائیں یعنی قَرْف بن جائے تو ان سب الفاظ کے گو ظاہری معنے مختلف ہوں گے مگر ان سب میں مشارکت خواہ موافقت کے لحاظ سے ہو خواہ مخالفت کے لحاظ سے۔ ضرور پائی جائے گی۔ پس جب کوئی لفظ عربی زبان کا ایسا ہو کہ جس کے ساتھ اس کے مشابہ الفاظ کے معنوں میں بھی مشارکت پائی جائے تو وہ یقیناً عربی کا ہی ہو سکتا ہے مستعار نہیں کہلا سکتا کیونکہ مستعار لفظ تو ایک لیا جاتا ہے مگر جس لفظ کی جڑیں تک عربی زبان میں نظر آ رہی ہوں اسے مستعار کس طرح کہا جا سکتا ہے اسی مشارکت کو اصطلاحی طور پر اشتقاقِ کبیر کہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فُرْقَان کے لفظ کے عربی ہونے پر اشتقاقِ کبیر شہادت دے رہا ہے مثلاً فَرَق کے معنے عربی زبان میں جُدائی اور ڈر کے ہیں چنانچہ فَرَقَ کے معنے ہیں دو چیزوں کو ایک دوسری سے الگ کر دیا اور فَرِقَ کے معنے ہیں ڈر گیا (اور ڈرنا بھی جدائی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ڈر کر انسان دُور بھاگتا ہے) اور فُرْقَان فَرَقَ کا مصدر ہے چنانچہ اقرب الموارد جو ایک عیسائی کی لکھی ہوئی لغت ہے اُس میں لکھا ہے فَرَقَ یَفْرُقُ فَرْقًا وفُرْقَانًا یعنی عربی کے لفظ فَرَقَ کا مصدر فَرْقٌ بھی آتا ہے اور فُرْقَانٌ بھی آتا ہے اب ہم اشتقاقِ کبیر کے ماتحت ف ر ق کے

اشتقاق سے اس بات کا ثبوت کہ فرقان عربی لفظ ہے۔

دوسرے مجموعوں کو دیکھتے ہیں۔ پہلا مادہ اس کے مشارک حروف کا فَقْرٌ ہے۔ فَقْرٌ کے معنے غربت کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ غریب آدمی امیروں سے جُدا ہو جاتا ہے پس یہاں بھی جُدائی کے معنے پائے جاتے ہیں جُدائی کا ضد اتصال ہے یہ معنے بھی ف ق ر کے اجتماع میں پائے جاتے ہیں چنانچہ فقر کے معنے آپس میں ملا دینے کے بھی ہیں چنانچہ ہار میں تاگا پرونے کو بھی فَقْرٌ کہتے ہیں اسی طرح ریڑھ کی ہڈی بھی فقرات ظہر کہلاتی ہے کیونکہ وہ بھی ہار کی شکل کی بنی ہوتی ہے یعنی الگ الگ ٹکڑوں کے اندر ایک سفید تاگا گذرتا ہے پھر دوسرا اجتماع ف ر ق کا قَرَف اور قَفر کی شکل میں ہو سکتا ہے ان میں بھی وہی دونوں معنے پائے جاتے ہیں یعنی جدائی اور اتصال کے معنے چنانچہ قَرْفٌ کے معنے چھلکے اُتارنے کے ہوتے ہیں جس میں جُدائی کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی طرح قَرْفٌ کے معنے زخم کو چھیلنے کے ہوتے ہیں۔ قَرْفٌ کے معنے عیب لگانے کے ہوتے ہیں اور عیب گیری بھی تفرقہ پیدا کرتی ہے اسی طرح اور بھی چند معنے اس کے ہوتے ہیں۔ مثلاً رشتہ داروں کے لئے مال کمانا اور چیزوں کو آپس میں ملا دینا اور قَارَفَ کے معنے قریب ہو جانے کے ہوتے ہیں گویا ان معنوں میں بھی افتراق اور اتصال دونوں معنے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح قَفَرَ کے معنے کسی کے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں تَقَفَّرَ کے معنے جمع کرنے اور اَقْفَرَ کے معنے خالی ہو جانے کے ہوتے ہیں اور قَفْرٌ کے معنے جنگل کے ہوتے ہیں۔ جو آبادیوں میں فاصلہ پیدا کر دیتا ہے اور قَفَارٌ اُس روٹی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سالن نہ ہو۔ اب رہی ف ر ق کے اجتماع کی تیسری شکل۔ سو وہ رِفْقٌ اور رقف ہے یعنے ر پہلے ہے اور ف ق یا ق ف بعد میں آتے ہیں رِفْقٌ کے معنے نرمی کے ہیں جو اجتماع کا ذریعہ ہوتا ہے رَفَقَ کے معنے باندھ لینے کے بھی ہوتے ہیں اور رَفِیْقٌ کے معنے ساتھی کے ہوتے ہیں اور رَافَقَ کے معنے دوستی کے ہوتے ہیں اسی طرح مِرْفَقٌ کہنی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دو ہڈیوں کو ملاتی ہے

رقّت کا پھٹنے کو کہتے ہیں جو ڈر کا نتیجہ ہوتا ہے اور فَرَقَ کے ایک معنے بھی ڈر کے بتائے جا چکے ہیں پس ف ر ق سے جتنے الفاظ عربی زبان میں بنتے ہیں ان سب میں انفصال یا افتراق کے معنے پائے جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ فرقان کا لفظ غیر زبان سے آیا ہے عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ میں تو یہ بھی ثابت کر سکتا ہوں کہ اشتقاقِ اکبر کے لحاظ سے بھی فرقان کا لفظ عربی ہی ثابت ہوتا ہے یعنی ف ر ق کے مجموعہ میں ہی معنوں کا اشتراک نہیں پایا جاتا بلکہ اُن کے قریب المخارج الفاظ کے معنوں میں بھی فُرْقَان کے ساتھ اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً ف کی جگہ واو رکھ دیں ر کی جگہ ل رکھ دیں ق کی جگہ ث رکھ دیں تب بھی بہت سے الفاظ میں معنوں کا اشتراک پایا جائے گا مگر چونکہ یہ تفسیر کی کتاب ہے ادبی کتاب نہیں اس لئے میں اس تفصیل میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

جیسا کہ حلِّ لغات میں بتایا جا چکا ہے فُرْقَان کے اصل معنے تو فرق کر دینے یا دو چیزوں میں امتیاز کر دینے کے ہیں اب رہا یہ سوال کہ اس جگہ پر اسلامی اصطلاح میں فُرْقَان کے کیا معنے ہیں سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مختلف مفسرین نے اس کے مختلف معنے کئے ہیں تفسیر جریر جلد اوّل میں ابو العالیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا فُرْقَان کے معنے ہیں فَرِقَ بِهٖ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ یعنی ایسی چیز جس کے ذریعہ حق اور باطل میں فرق کر دیا گیا ہو۔ مجاہد کا قول ابن جریر نے یہ لکھا ہے کہ فُرْقَان سے مُراد کتاب ہی ہے اور اس کے معنے حق اور باطل میں فرق کرنے والے کے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس کا یہ قول لکھا ہے کہ فُرْقَان مجموعی نام ہے تورات زبور انجیل اور قرآن کا۔ ابن زید سے ابن جریر نے یہ روایت کی ہے کہ فُرْقَان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ملا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ملا۔ بدر کے موقع پر خدا تعالیٰ نے مشرکوں اور مسلمانوں میں امتیاز کر کے دکھا دیا اور واقعۂ سمندر کے رو سے خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اُن کے دشمنوں میں فرق کر کے دکھا دیا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں بعض لوگوں نے اس آیت کے معنے یہ کئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرقان دیا۔ اختصار کے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بیان نہیں کیا لیکن یہ معنے بالبداہت غلط ہیں اسی طرح وہ لکھتے ہیں جن لوگوں نے فُرْقَان کے معنے کتاب کے کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کتاب کے بعد فرقان کا لفظ تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے چنانچہ زجاج کا یہی قول ہے اور یہی فراء نے بھی بیان کیا ہے۔ بعضوں نے فُرْقَان کے معنے مصیبت سے نجات کے کئے ہیں۔ اور اس سے مراد مصر سے نکلنے کو لیا ہے اور ابن بحر نے کہا ہے کہ حجت اور بیان اس کے معنے ہیں بعض نے کہا ہے واو زائد ہے۔ اور فُرْقَان کتاب کی صفت ہے (تفسیر القرطبی جلد اوّل)

خلاصہ ان حوالوں کا یہ ہے کہ فُرْقَان کے معنے حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں آگے اس بات کی تعیین کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کس چیز کو خدا تعالیٰ نے حق و باطل میں تمیز کرنے والی قرار دیا ہے اس کے متعلق بعض نے یہ تاویل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو ہی فرقان قرار دیا گیا ہے بعض نے غرقِ فرعون کو اور بعض نے مصر سے اُن کے بچ کر نکل آنے کو اس لفظ کا مستحق بتایا ہے لیکن میرے نزدیک کتاب اور فرقان کو ایک قرار دینا قرآن کریم کے دوسرے مقامات کو مدِّ نظر رکھ کر کچھ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فرقان کے معنے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (انبیاء ع ۴) یعنے ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور متقیوں کے لئے نصیحت عطا فرمائی تھی۔ اس آیت میں فُرْقَان کے دینے میں حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ پس فرقان کے معنے تورات کے نہیں لئے جا سکتے۔

کتاب اور فرقان دونوں ایک نہیں ہو سکتے

قرآن کریم میں فُرْقَان کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے (۱) فُرْقَان کا لفظ قرآن کریم کی نسبت بھی استعمال

قرآن کریم میں فرقان کے لفظ کا استعمال مختلف معنوں میں

ہوا ہے جیسے سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝ (ع ۱) برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر فُرقان اُتارا تاکہ وہ ساری دنیا کے لئے نذیر بنے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فُرقان قرآن کریم کا نام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعلق سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (ع ۲۳) یعنی رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں اللہ نے قرآن کریم اُتارا ہے جس قرآن میں ایک تو لوگوں کے لئے ہدایت ہے دوسرے اس میں دلائل ہیں ہدایت کے اور دلائل ہیں فُرقان والے یعنی ایسے دلائل جو حق اور باطل میں تمیز کر دیتے ہیں۔ اس آیت کے ذریعہ قرآن کریم کو فُرقان پر مشتمل بتایا گیا ہے قرآن کریم میں فرقان کے ایک معنی مصیبت اور مشکل سے نجات کے بھی

ہر نبی کو فرقان دیا جاتا ہے

آتے ہیں چنانچہ سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (ع ۴) اے مومنو اگر تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہر مصیبت اور مشکل سے بچنے کا راستہ نکال دے گا۔ ان آیات پر غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ درحقیقت فُرقان کے معنے حق و باطل میں تمیز کرنے والی چیز کے ہی ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فُرقان کا وعدہ کیا ہے تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ مشکلات کے وقت ان کو ایسی تمیز بخش دیگا کہ وہ صحیح راستہ معلوم کرنے کے قابل ہو جائینگے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فُرقان ملا تھا تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ اُنہیں کوئی ایسی چیز ملی تھی جس سے وہ اپنے دوست اور دشمن اور حق اور باطل میں تمیز کر سکتے تھے اور اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کوئی چیز ایسی ملی تھی جس کو ہم فُرقان کہہ سکتے ہیں تو اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ آپ کو ایسی چیز ملی تھی جس سے آپ اور آپ کے اتباع حق اور باطل میں تمیز کر لیتے تھے اور آپ کے مخالف اگر چاہتے تو اسکی مدد سے حق کو سمجھ سکتے تھے پس کوئی وجہ نہیں کہ فُرقان کے معنے محدود کئے جائیں اور اسے بدر کی جنگ یا سمندر سے بچ نکلنے کے معجزوں تک محدود کیا جائے۔ بیشک بدر کی جنگ کو بھی فرقان کہا گیا ہے اور بیشک سمندر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بچ نکلنا ایک فرقان تھا مگر صرف یہی دو چیزیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ملیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور ہزاروں معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ملے تھے پس جہاں کسی خاص معجزے کا نام قرآن کریم نے فُرقان رکھا ہے (جیسے بدر کے معجزہ کا) وہاں تو ہم اُس کے وہ خاص معنے کرینگے لیکن جہاں کسی خاص معجزے کا ذکر نہیں کیا وہاں ہم فُرقان کے معنوں کو محدود نہیں کر سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی شریعت دی جاتی ہے خواہ وہ نئی ہو یا پُرانی (یعنے سابق نبی کی شریعت پر عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے) اسی طرح فُرقان دیا جاتا ہے یعنی ایسے نشانات دیئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز ہو سکے اور یہ فرقان ہی ان کی سچائی کو پہچاننے کا حقیقی ذریعہ ہوتا ہے ہر زمانہ میں لوگوں نے اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے سچے نبیوں کو ماننے سے انکار کیا ہے یا جھوٹے نبیوں کے فریب میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی صداقت کسی ایک چیز پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ انہیں بیسیوں قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں جو بحیثیت مجموعی انکی سچائی یا ان کے درجہ کی بلندی پر گواہ ہوتے ہیں بعض لوگ صرف چند خواب یا الہام دیکھ کر اپنے آپ کو مامور قرار دینے لگ جاتے ہیں حالانکہ خوابیں اور الہام خیالی بھی ہو سکتے ہیں بیماریوں کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں طبعی بھی ہو سکتے ہیں شیطانی بھی ہو سکتے ہیں اور رحمانی بھی ہو سکتے ہیں۔ صرف کسی خواب یا الہام کا سچا ہو جانا بھی اس کے رحمانی ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ طبعی اور خیالی باتیں بھی کئی دفعہ پوری ہو جاتی ہیں

انبیاء کے الہام تو اپنے اندر ایک خاص شان رکھتے ہیں ان کے اندر وسعت ہوتی ہے زمانہ کے مفاسد کا علاج ہوتا ہے اور زمانہ کے حالات پر وہ حاوی ہوتے ہیں۔ پس خالی الہام بعض کمزور طبائع کے لئے امتیاز کا موجب نہیں ہوتے مگر الہام کے علاوہ انبیاء کو اپنے دعویٰ سے پہلے ایک پاکیزہ اور ممتاز زندگی ملا کرتی ہے۔ قرآن کریم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ع۲) الہام میں غلطی دماغی کمزوری کا نتیجہ کہلا سکتی ہے لیکن اِس شان کے انسان کی طرف دماغی کمزوری کا منسوب کرنا مشکل ہو جاتا ہے پس گو الہام کی سچائی بھی ایک دلیل ہے۔ گو دعوے سے پہلے کی زندگی کی پاکیزگی بھی ایک دلیل ہے مگر یہ دونوں دلیلیں مل کر ایک تیسری دلیل سچائی کی پیدا کر دیتی ہیں جو اپنی ذات میں بہت بڑی شان رکھتی ہے اور یہ فُرقان ہے۔ پھر قرآن کریم میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کو تو دیکھو جو اس پر ایمان لائے ہیں وہ خود اپنی ذات میں ایک بھاری ثبوت ہیں۔ آخر انسان مختلف درجات اور طبقوں کے ہوتے ہیں۔ کوئی بداخلاق اور طامع لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی جاہل اور جلدی فریب میں آجانے والے ہوتے ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے لوگوں میں سے بعض تو وہ تھے جنہوں نے خود اپنے ملک میں اپنے فن اور اپنی عقل اور اپنے علم کی وجہ سے خاص مرتبہ حاصل کیا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا آپؐ پر ایمان لانا خود اپنی ذات میں آپؐ کی صداقت کی ایک بڑی بھاری دلیل تھی وہ آدمی جو نہ جذباتی تھے نہ جاہل تھے نہ بدعمل تھے۔ دلیل اور عقل کے پیچھے چلنے والے علم رکھنے والے۔ قربانیاں کرنے والے۔ غرباء کی امداد کرنے والے اور مختلف فنون کے ماہر تھے آخر انہیں کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ اپنی قوم میں اپنے آپ کو ذلیل کر کے ایک ایسے شخص کے پیچھے چلتے جو اپنے اندر سچائی کی علامتیں نہ رکھتا تھا اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی دلیل خدا تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اُن کے دشمن تباہ ہو رہے ہیں۔ یہ بھی اپنی ذات میں ایک زبردست دلیل ہے مگر جس وقت یہ پچھلی تین دلیلوں سے مل جائے تو یہ اَور زیادہ شان پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی ایک یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مفاسد پیدا ہو رہے ہیں ان کو یہ دُور کرتا ہے۔ لوگوں کی علمی اعتقادی اور عملی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی ذات میں ایک بڑی بھاری دلیل ہے لیکن جس وقت یہ پچھلی دوسری دلیلوں کے ساتھ مل جاتی ہے تو یہ اَور بھی زیادہ شان پیدا کر دیتی ہے ہم یہ تو مان لیتے ہیں کہ بعض الہام طبعی بھی ہوتے ہیں اور خیالی بھی ہوتے ہیں اور یہ بھی ہم مان لیتے ہیں کہ طبعی اور خیالی الہام بعض دفعہ سچے بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماننا ہمارے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے کہ خیالی اور طبعی الہام جو دماغی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور شیطانی الہام جو روحانی اور اخلاقی کمزوری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس شخص کو اپنے لئے منتخب کیا جسکی زندگی کی پاکیزگی کا سارا ملک شاہد تھا چلو ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ایسے طبعی یا خیالی یا شیطانی الہام ایک ایسے شخص کو ہو گئے جسکی پاکیزہ زندگی کا سارا ملک شاہد تھا لیکن ہمارے لئے یہ ماننا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک راستباز تھا اس کا دماغ بگڑ گیا لیکن باوجود اس کے ملک کے نہایت سمجھدار طبقہ کا ایک حصہ جنہوں نے اسے قریب سے دیکھا تھا اور جنکی اپنی عقل کا ملک گواہ تھا اس کی سچائی پر گواہی دینے لگا پھر چلو ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ غلطی بھی ہو گئی مگر یہ بات ہمارے لئے ماننی کتنی ناممکن ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ کے غلط خیالات خواہ عقیدہ کے لحاظ سے ہوں یا علمی لحاظ سے ہوں یا عمل کے لحاظ سے ہوں اُنکی اصلاح بھی اس شخص سے ہوئی۔ معترض مانتا ہے کہ شرک بُرا ہے اور معترض مانتا ہے کہ اس شرک کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی دُور کیا۔ پھر وہ یہ بھی مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الہام کے مدعی تھے اور اُس کے نزدیک

ان میں سے بعض اتفاقی طور پر پورے بھی ہو جاتے تھے وہ مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی دعوے سے پہلے بڑی پاکیزہ تھی وہ مانتا ہے کہ ان کے ماننے والے ایسے لوگ تھے جنہوں نے انکی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا تھا اور وہ خود بھی اپنی عقل اور اپنے علم اور اپنے نیک

۲ قرآن کریم کو فرقان کہے جانے کی وجہ

اعمال کی وجہ سے مُلک میں مشہور تھے وہ مانتا تھا کہ جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مانا وہ اتفاقی طور پر جیت گئے اور ان کے دشمن اتفاقی طور پر ہار گئے اور پھر وہ یہ بھی مانتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شرک کے دُور کرنے کی بھی توفیق ملی جسکی غلطی کو وہ خود بھی تسلیم کرنے والا ہے اسی طرح اور بیسیوں عقائد کی اصلاح کی توفیق آپ کو ملی جن میں سے بعض اصلاحات کے صحیح ہونے کو دشمنوں میں سے ایک فریق اور بعض کے صحیح ہونے کو دوسرا فریق مانتا ہے اب اس سارے مجموعہ کو دیکھتے ہوئے کون شخص کہہ سکتا

۲ انبیاء کو فرقان کا ملنا ان کے صادق ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعوذ باللہ فاتر العقل تھے یا دماغ کی کمزوری کے مریض تھے یا نعوذ باللہ شیطان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ایک دلیل میں الگ الگ تو شبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایک دلیل کو الگ الگ تو اتفاقی قرار دیا جا سکتا ہے مگر ان سب امور اور ایسے ہی اور سینکڑوں امور کے ایک شخص کی ذات میں جمع ہو جانے کو تو کسی صورت میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اگر اس اجتماع کے ہوتے ہوئے بھی شبہ باقی رہ سکتا ہے تو پھر دنیا کی کسی بات کو بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی مجموعے کا نام میرے نزدیک فُرْقَان ہے۔ یہی مجموعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا یہی مجموعہ حضرت داؤد علیہ السلام کو ملا۔ یہی مجموعہ حضرت عیسیٰ

۱ انبیاء میں کثرت سے ایسے دلائل کا جمع ہو جانا جو ان کی صداقت کو پوری طرح واضح کردیں فرقان کہلاتا ہے

علیہ السلام کو ملا۔ یہی مجموعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملا۔ اور یہی مجموعہ آج بانئ سلسلہ احمدیہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملا ہے۔ دشمن ہمیشہ ایک ایک چیز کو لے کر اعتراض کرنے لگ جاتا ہے حالانکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اعتراض تو ہر چیز پر ہو سکتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ بیسیوں قسم کے دلائل کا مجموعہ اس میں کس طرح جمع ہو گیا ہے۔ اگر ایسا مجموعہ کسی میں جمع ہو تو یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے فُرْقَان ملا ہے اور یقیناً وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو گا یہ فُرْقَان کبھی کسی جھوٹے آدمی کو نصیب نہیں ہو سکتا ہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسرے نبیوں سے ایک امتیاز حاصل ہے اور وہ یہ کہ دوسرے نبیوں کو کتاب اور اس کے علاوہ فُرْقَان ملا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرقان الگ بھی ملا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی اسے بھی فُرْقَان بنایا گیا۔ تورات اپنی سچائی کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے معجزات کی تائید کی محتاج تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الہامات دوسرے معجزات کی تصدیق کے محتاج تھے۔ وید اور ژند کا بھی یہی حال ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب اپنی ذات میں بھی فُرْقَان ہے یعنی وہ ایک زندہ کتاب ہے اور اگر دوسرے معجزات لوگوں کو بھول بھی جائیں تب بھی وہ اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر شامل رکھتی ہے اسی وجہ سے اس کا نام فُرْقَان رکھا گیا ہے اور کسی سابق الہامی کتاب کا نام فُرْقَان نہیں رکھا گیا کیونکہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے دوسرے دلائل کی محتاج ہیں مگر قرآن کریم اپنی سچائی کا ثبوت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم کو ماننے والوں کی نسبت یَجْعَل لَّکُمْ فُرْقَانًا (انفال ع ۴) فرمایا گیا ہے یعنی یہ کتاب چونکہ خود فُرْقَان ہے اس لئے اس پر ایمان لانے والوں کو بھی اگر وہ درجۂ کمال تک ایمان لائیں فُرْقَان ملتا ہے۔ یہ دلیل انبیاء علیہم السلام کی صداقت پہچاننے کی ایک ایسی ہمہ پیوست اور جامع دلیل ہے کہ اگر کوئی شخص اس دلیل کو سمجھ کر انبیاء کی شناخت کی کوشش کرے تو اس کے لئے اپنے زمانہ کے مامور کو پہچاننا کوئی مشکل کام

لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ فرماتا ہے:

کتاب اور فرقان ہم نے موسیٰ کو اس لئے دیئے تھے تاکہ بنی اسرائیل ہدایت پائیں مگر افسوس انہوں نے نہ کتاب

لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم (کے لوگو) تم نے بچھڑے کو (معبود) بنا کر یقیناً اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

اس لئے تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف جھکو اس طرح سے کہ اپنے (آدمیوں) کو (آپ) قتل کرو

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ

یہ بات تمہارے پیدا کرنیوالے کے نزدیک تمہارے حق میں بہت اچھی ہے تب اس نے تمہاری طرف فضل کے ساتھ پھر توجہ کی

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى

وہ یقیناً (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہے ۵۴ اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا

سے فائدہ اُٹھایا اور نہ فرقان سے فائدہ اُٹھایا لَعَلَّ کے لفظ سے اِس جگہ شک کا مفہوم نہیں سمجھنا چاہیئے یہ شاہانہ کلام ہے اور گو لغوی لحاظ سے اس لفظ میں قطعیت نہ پائی جاتی ہو لیکن شاہی کلام میں جب اس قسم کے الفاظ آئیں تو اُن میں قطعیت کا مفہوم ہی پایا جاتا ہے۔ بادشاہ اپنے فرامین میں ہمیشہ لکھتے ہیں کہ ہم فلاں قوم سے یہ امید کرتے ہیں حالانکہ اس سے مراد حکم ہوتا ہے۔ یہاں بھی لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ کے یہی معنے ہیں کہ ہم نے یہ چیزیں دیں اور ہم بنی اسرائیل سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ہدایت پائیں یعنی ہمارا احسان کا تقاضا تھا کہ وہ ہدایت پائیں اور اس کا طبعی نتیجہ بھی نکلنا چاہیئے تھا کہ وہ ہدایت پا جاتے لیکن انہوں نے ہمارے احسان کی قدر نہ کی اور اپنی فطرت کو بھی ایسا مسخ کر دیا کہ طبعی نتیجہ یعنی ہدایت سے محروم ہو گئے۔

۵۴ حل لغات۔ ظَلَمْتُمْ۔ ظَلَمَ سے جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے اور ظَلَمَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ن۳۶

اَنْفُسَكُمْ۔ اَنْفُسٌ نَفْسٌ کی جمع ہے اور نَفْسٌ کے معنی کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ن۴۷

تُوْبُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ تَابَ يَتُوْبُ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ن۴۸

لعلکم تھتدون کی تشریح

بَارِئِكُمْ: اَلْبَارِئُ بَرَأَ سے اسم فاعل ہے اور بَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کے معنے ہیں خَلَقَهُمْ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اَلْبَارِئُ کے معنے ہیں اَلْخَالِقُ پیدا کرنے والا (اقرب)

اقتلوا

اُقْتُلُوْا۔ اُقْتُلُوْا امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور قَتَلَهٗ کے معنے ہیں اَمَاتَهٗ بِضَرْبٍ اَوْ حَجَرٍ اَوْ سَمٍّ اَوْ عِلَّةٍ کسی قسم کی ضرب یا پتھر کے مارنے یا زہر دینے یا اور کسی وجہ سے اسکی رُوح کو اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا اور جب قَتَلَ الْجُوْعَ وَالْبَرْدَ کہیں تو معنے ہونگے كَسَرَ شِدَّتَهٗ کہ اس نے بھوک کی تیزی اور سردی کی شدت کو دُور کر دیا۔ اور قَتَلَ اللّٰهُ الْاِنْسَانَ وَقَاتَلَهٗ کے معنے ہیں لَعَنَهٗ کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص پر لعنت نازل کی اور اپنے سے دُور کر دیا (اقرب) مفردات راغب میں اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ کے ماتحت لکھا ہے لِيَقْتُلْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا یعنی اس کے معنے یہ ہیں کہ تم میں سے غیر مشرک مشرک کو خود قتل کر دیں۔ وَقِيْلَ عَنٰى بِقَتْلِ النَّفْسِ اِمَاطَةَ الشَّهَوَاتِ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قتل نفس سے مُراد خواہشات نفسانیہ کو دُور کرنا ہے چنانچہ

اسی معنے میں یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ قَتَلْتُ الْخَمْرَ بِالْمَاءِ
اَیْ اِذَا مَزَجْتَهٗ یعنی شراب کو پانی کے ساتھ ملا کر قتل
کر دیا یعنی اسکی شدت کو ہلکا کر دیا نیز کہتے ہیں قَتَلْتُ فُلَانًا
وَقَتَّلْتُهٗ اِذَا ذَلَّلْتَهٗ یعنی جب کسی کو عاجز اور ذلیل
کر دیا جائے تو اس وقت بھی قتل کا لفظ استعمال کرتے ہیں
اور کہہ دیتے ہیں کہ میں نے فلاں کو قتل کر دیا۔ لسان العرب میں
قَتَلَ کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر جب خلافت کا انتخاب
ہونے لگا تو بعض لوگوں نے اس وقت اختلاف کیا اور
ان میں سے ایک سعد بھی تھے تو ان کے متعلق کہا گیا قَتَلَ
اللّٰهُ سَعْدًا فَاِنَّهٗ صَاحِبُ فِتْنَةٍ وَشَرٍّ کہ اللہ تعالیٰ
سعد کو قتل کرے کیونکہ وہی فتنہ و فساد کی جڑ ہیں اور مطلب
یہ تھا کہ دَفَعَ اللّٰهُ شَرَّهٗ یعنی اللہ تعالیٰ سعد کے شر کو
دفع کرے اور اس کے ارادوں کو پورا نہ کرے۔ اور ایک
روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا اُقْتُلُوْا سَعْدًا
قَتَلَهُ اللّٰهُ کہ سعد کو قتل کر دو اللہ تعالیٰ اسے قتل کرے
اور مطلب یہ تھا کہ اِجْعَلُوْهُ كَمَنْ قُتِلَ وَاحْسِبُوْهُ
فِیْ عِدَادِ مَنْ مَاتَ وَهَلَكَ وَلَا تَعْتَدُّوْا بِمَشْهَدِهٖ
وَلَا تُعَرِّجُوْا عَلٰى قَوْلِهٖ یعنی اے لوگو تم سعد کی طرف
التفات نہ کرو بلکہ اپنی توجہ کو اس سے ہٹا کر اسے ایسا
کر دو کہ گویا وہ مقتول ہے اور اس کو ان لوگوں میں شمار
کرو جو مر چکے ہوں اور اس کو کسی گنتی میں نہ لاؤ اور اللہ تعالیٰ
سے دعا ہے کہ وہ بھی اس سے ایسا ہی سلوک کرے۔ اسی
طرح حضرت عمرؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس کے الفاظ یہ
ہیں کہ مَنْ دَعٰی اِلٰی اِمَارَةِ نَفْسِهٖ اَوْ غَیْرِهٖ مِنَ
الْمُسْلِمِیْنَ فَاقْتُلُوْهُ اَیْ اِجْعَلُوْهُ كَمَنْ قُتِلَ
وَمَاتَ بِاَنْ لَا تَقْبَلُوْا لَهٗ قَوْلَهٗ وَلَا تُقِیْمُوْا لَهٗ
دَعْوَةً یعنی جو شخص اپنی خلافت یا اور کسی کی خلافت کا
پروپیگنڈا کرے اور لوگوں کو کہے کہ اسے یا فلاں شخص کو
خلیفہ بناؤ۔ اس کو قتل کر دو یعنی اسکی بات کو قبول نہ کرو اور

توبوا الی بارئکم میں لفظ باری استعمال کرنے کی حکمت اور اس کے معنے

مکمل طور پر اس سے قطع تعلق کر لو اور اسے اس ذریعہ سے
ایسا کر دو کہ گویا وہ مقتول ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں
ہے اِذَا بُوْیِعَ بِخَلِیْفَتَیْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ
مِنْهُمَا اَیْ اَبْطِلُوْا دَعْوَتَهٗ وَاجْعَلُوْهُ كَمَنْ مَاتَ
کہ جب دو خلیفوں کی بیعت کی جاوے تو آخری کو قتل کر دو
یعنی اس کی دعوت کی طرف کان نہ رکھو بلکہ اس سے قطع تعلق
کر کے اسے قتل کئے جانے کے حکم میں کر دو (لسان) پس
قَتَلَ کے عام مشہور معنوں کے علاوہ اس کے معنے ذلیل
کرنے اور قطع تعلق کرنے کے بھی ہیں۔

اَنْفُسَكُمْ۔ اَنْفُسَكُمْ کے لئے دیکھو حل لغات
سورۃ ہذا ع۴۵
تَابَ۔ تَابَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات
سورۃ ہذا ع۳۸
اَلتَّوَّابُ:۔ اَلتَّوَّابُ کے معنے کے لئے دیکھو
حل لغات سورۃ ہذا ع۳۸
اَلرَّحِیْمُ:۔ الرَّحِیْمُ کے معنے کے لئے دیکھو
حل لغات سورۃ فاتحہ ع۲

تفسیر۔ یہ بتانے کے بعد کہ بنی اسرائیل نے اس
موقعہ پر بھی جبکہ عظیم ترین احسان ان پر ہو رہا تھا خدا تعالیٰ
کی شدید ترین نافرمانی کی۔ فرماتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اکثر
کو اس موقعہ کے لحاظ سے سزا دینی ضروری تھی کیونکہ ایسے عظیم الشان
موقعہ پر شرک کا جرم کلی طور پر معاف کر دینا گناہوں پر دلیر
کرنے کا موجب ہو سکتا تھا۔ پس فرمایا کہ اے بنی اسرائیل تم
نے اپنی جان پر شرک کر کے بڑا ظلم کیا ہے اس لئے اپنے
بَارِئ کے حضور بہت توبہ کرو۔ بَارِئ کے معنے جیسا کہ
حل لغات میں بتائے گئے ہیں پیدا کرنے والے کے ہیں۔ لیکن
خَالِقٌ کے لفظ سے اس کے معنوں میں کچھ فرق ہے بَرَءَ کا
لفظ عیب اور نقص سے پاک ہونے پر بھی دلالت کرتا ہے اس
لئے ائمہ زبان نے اس کے معنے نقائص سے پاک خلق کے
کئے ہیں چنانچہ زمخشری اپنی کتاب کشاف میں لکھتے ہیں اَلْبَارِئُ

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بَرِیْٓـئًا مِّنَ التَّفَاوُتِ، یعنے بَارِئٌ کے معنے ہیں وہ جس نے مخلوق کو اختلاف و نقصان سے پاک پیدا کیا ہو علامہ ابوحیان نے بھی ان کے ان معنوں کی تعریف کی ہے اور علامہ ابوحیان نحو اور لغت کے ایک بہت بڑے ماہر ہیں اور انکی تفسیر بحرالمحیط چوٹی کی تفسیروں میں سے ہے وہ زمخشری کے اس استدلال کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ یہ استدلال کلام حسن ہے یعنے بہت لطیف استدلال ہے۔ یہ استدلال علامہ زمخشری کا اس لفظ کے دوسرے الفاظ سے ہے بَرْءٌ کے معنے عربی زبان میں عیب و نقص سے پاک ہونے کے ہوتے ہیں۔ لسان العرب میں بھی لکھا ہے کہ خَلَقَ اور بَرَءَ میں یہ فرق ہے کہ خلق سب قسم کی مخلوق کے لئے آتا ہے لیکن بَرَءَ کا لفظ عموماً ذوی الارواح کی نسبت بولا جاتا ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں بَرَءَ اللّٰہُ النَّسَمَۃَ وَخَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ یعنے ارواح کی پیدائش کے لئے بَرَءَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش کے لئے خَلَقَ کا۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ نسبتاً کامل مخلوق کی پیدائش کے لئے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں مصائب کی پیدائش کی نسبت بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے (حدید آیت ۲۳ ع ۳) مگر وہاں بھی چونکہ ذوی الارواح کا ہی ذکر ہے یہ استعمال مشارکت کی وجہ سے ہوا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بَرِیٌ کا عام استعمال غیر ذوی الارواح کے لئے جائز ہے چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ (حشر ع ۳) یعنے اللہ بارئ اور خالق ہے ایک جگہ دونوں لفظوں کا استعمال بتاتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک دونوں لفظ ہم معنی نہیں ہیں بلکہ دونوں الگ الگ خصوصیت کے حامل ہیں پس اللہ تعالیٰ کے بَارِئٌ نام کے یہ معنی ہیں کہ نہ صرف پیدا کرتا ہے بلکہ وہ خاص قسم کے اخلاق اور ترقی کرنے والی قوتیں بھی عطا فرماتا ہے پس اس جگہ پر بَارِئٌ کا لفظ استعمال فرما کر ایک لطیف اشارہ شرک کی تردید کے متعلق کیا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل نے بھی گھڑ گھڑا کر ایک بت تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ خالق مخلوق سے اچھا ہوتا ہے اور گھڑنے والا گھڑی ہوئی چیز سے بہتر ہوتا ہے۔ ایک تصویر بڑی اچھی چیز ہے مگر اس کا مصوّر اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر ہے کیونکہ وہ ویسی ہی بلکہ اس سے بڑھ کر تصویریں بنانے کی قابلیت رکھتا ہے تُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ کہہ کر فرمایا کہ اے نادانو تم اپنے ہاتھ کی ادنیٰ اور بےجان گھڑی ہوئی چیزوں کے آگے سجدہ کرنے لگ گئے لیکن جس نے تم کو کامل طور پر جاندار بنا کر پیدا کیا تھا اس کو بھول گئے مگر صنعت کوئی قابلِ قدر چیز ہے تو صناع اس سے بھی بڑھ کر قابلِ قدر ہے کیونکہ وہ صنعتوں کا منبع ہے پس اگر کوئی اچھی صنعت تمہاری توجہ کو کھینچ لیتی ہے تو تمہیں صنعت سے صانع کی طرف توجہ کرنی چاہیئے تھی اور شرک کی بجائے توحید کو اختیار کرنا چاہیئے تھا

۱ لفظ بَرْءٌ اور خَلَق میں فرق

غرض تُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ کہہ کر توبہ کے مضمون کے علاوہ صرف اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرنے کی ضرورت اور حقیقت پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ تین لفظوں میں ہزاروں الفاظ کا مضمون بیان کر دیا گیا ہے۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ قتل کے معنی جیسا کہ حل لغات سے ظاہر ہے قتل کے بھی ہوتے ہیں اور قطع تعلق کے بھی ہوتے ہیں

۲ اقتلوا انفسکم میں قتل کے معنے حقیقۃً قتل کرنے کے

بعض مفسرین نے اس جگہ قتل سے مراد اپنے نفس کو قتل کرنے یعنی اپنی خواہشات کو مارنے کے لئے ہیں لیکن بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الواقع بعض آدمیوں کو قتل کی سزا دی گئی تھی اور اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ پہلے عفو کا اعلان کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اس موقع کی شناخت کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت بعض افراد کو قتل کی سزا بھی دی گئی تھی۔ بائبل میں اس کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے۔

"اور اس (موسیٰ) نے انہیں (بنو لاوی کو) کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکرگاہ میں گذرتے پھرو اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو۔ ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک